پاکستان میں جمہوری وفاقیت کا بحران اور قومی خود مختاری

جامی چانڈیو

CPCS

پاکستان میں جمہوری وفاقیت کا بحران

اور قومی خود مختاری

(وفاق کی از سرِ نو تشکیل اور نئے سماجی معاہدے کی دستاویز)

جامی چانڈیو

سینٹر فار پیس اینڈ سول سوسائٹی

ڈی-72، بلاک 2، لندن ٹاؤن، قاسم آباد حیدر آباد

Ph: +92 – 22 – 2116274

E – Mail: info@cpcs.org.pk

www.cpcs.org.pk

جملہ حقوق محفوظ

58

کتاب کانام: پاکستان میں جمہوری وفاقیت کا بحران
اور قومی خود مختاری

موضوع: سیاسیات (وفاقیت)

تحریر: جامی چانڈیو

کمپوزنگ اینڈ ٹائٹل ڈزائننگ: سلیمان سمیجو

سال: جولائی 2018ء

ناشر: سی پی سی ایس

قیمت: سو روپے

کتاب ملنے کی جگہ

مسٹر بکس اسلام آباد، سعید بوک شاپ اسلام آباد، فیروز سنز-مال روڈ لاہور، تھامس اینڈ تھ ،امس بُک ھائوس، کراچي-کاٹھیاواڑ بُک ھائوس کراچي-سندھیکا کتاب گھر، حیدر آباد-بھٹائي کتاب گھر، حیدر آباد- گلشن پبلیکیشن، حیدر آباد- فکشن ھائوس، حیدر آباد-رابیل کتاب گھر، لاڑکانہ- گل کتاب گھر، شکارپور -جنید کتاب گھر، دادو-سندھیکا کتاب گھر، سکر، مارئي کتاب گھر، سکر-مھران کتاب گھر، میرپورخاص-ھلال کتاب گھر، میرپورخاص، سندھ بُک کلب، نوابشاہ.

All Rights Reserved

Book Title:
Crisis of Democratic Federalism and
National Autonomy in Pakistan
Author:
Jami Chandio
Year:
July 2018
Published by:
CPCS

سی پی سی ایس کی جانب سے شایع کیا گیا

انتساب

ملک کی مظلوم قومیتوں اور مظلوم طبقات کی
قومی، طبقاتی اور جمہوری جدوجہد کے نام، جن
کے ساتھ پاکستان، وفاق اور آزادی کے نام پر
تاریخی دھوکہ ہوا۔

"وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں"

– جامی چانڈیو

فہرست

پاکستان میں وفاقیت کیوں؟ 5

پاکستان میں جمہوری وفاقیت کا بحران اور قومی خود مختاری 28

- برِصغیر کی تقسیم اور صوبائی خود مختاری 30
- مذہب کا ناجائز استعمال 32
- مسلم لیگ کی منافقت اور پاکستان کی بنیاد 34
- پاکستان کی تاریخ اور قومی/ صوبائی خود مختاری کا سوال 36
- پاکستان کے دساتیر اور قومی/ صوبائی خود مختاری 40
- جمہوری وفاقیت کا بحران اور قومی/ صوبائی خود مختاری کے مسائل 43
- قوموں کی آئینی خود مختاری 49
- قومی مالیاتی کمیشن اور مظلوم قوموں/ چھوٹے صوبوں کا معاشی استحصال 50
- قدرتی وسائل کا استحصال اور قومی/ صوبائی خود مختاری 57
- وفاقی بیوروکریسی اور چھوٹے صوبوں کے مقامی لوگوں کی نمائندگی 60
- پانی کا تنازعہ اور قومی/ صوبائی خود مختاری 64
- ثقافتی خود مختاری 69
- جمہوری وفاقیت کے بحران کے نتائج 71
- مظلوم قوموں کے قومی مطالبات 72

پاکستان میں وفاقیت کیوں؟

وفاقیت کیا ہے؟

وفاقی نظام کے بارے میں بعد از نو آبادیاتی معاشروں اور ممالک میں بہت سے ابہام، غلط فہمیاں اور مفروضات پائے جاتے ہیں۔ اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک تو ان تمام وفاقی ممالک کو یہ نظام نو آبادیاتی نظام (Colonial System) سے ورثے میں ملا، اس میں ان کی مرضی کم شامل تھی، دوسرا یہ کہ وہ نظام مرکزیت پسند تھا، جس سے حکمران طبقات یا بالادست گروہوں کے علاوہ دیگر آبادیاں خوش نہیں تھیں۔ وفاقی نظام سے بیزاری کا سبب یہ بھی تھا کہ نو آبادیاتی نظام میں جو دساتیر متعارف اور رائج کیے گئے وہ نہ صرف مرکزیت پسند تھے بلکہ ان میں مقامی آبادیوں کی شرکت بہت محدود تھی۔

وفاقی نظام ویسے تو رسمی طور پر جدید انسانی تاریخ میں اٹھارویں صدی کی آخری چوتھائی میں سامنے آیا مگر درحقیقت غیر آئینی صورت میں اس کے کچھ خدوخال ہزاروں برس سے بڑی سلطنتوں اور شہنشاہتوں میں بھی نظر آتے ہیں، کیوں کہ ان میں بھی مختلف مفتوح اور مقبوضہ علاقوں کو محدود حد تک انتظامی خود مختاری دی جاتی تھی۔ براہِ راست مقامی آبادیوں اور علاقوں کو خود مختاری نہ بھی تھی تو سلطنتوں اور شہنشاہتوں کے مرکز سے ذیلی علاقوں کے لیے گورنر یا شہنشاہت کے انتظامی نمائندے ضرور مقرر کیے جاتے تھے، جن کو محدود حد تک خود مختاری دی جاتی تھی۔ مصری، ساسانی، بازینطی، رومن، اُموی، عباسی، تُرک، مغل، فرنچ

اور برطانوی شہنشاہتوں میں یہ طریقہ صدیوں تک رائج تھا۔ گو کہ اس کو ہم جدید معنوں میں وفاقیت کا نظام نہیں کہہ سکتے، لیکن انتظامی اختیارات کو ذیلی حکومتوں تک ایک حد تک منتقل کرنے کو ہم ایک حد تک وفاقیت کی روح سے تعبیر کر سکتے ہیں، وہ الگ بات ہے کہ اس میں جمہوریت یا ذیلی حکومتوں کے مابین عمرانی معاہدے کا کوئی تصور موجود نہیں تھا اور نہ ہی ذیلی حکومتوں کو اپنے طور پر فیصلے سازی میں کوئی جزوی اختیار حاصل تھا۔

دنیا کی پہلی آئینی وفاقی ریاست اٹھارویں صدی میں تب وجود میں آئی جب 1776ع میں شمالی امریکہ کی 13 برطانوی نوآبادیات نے ازخود برطانوی شہنشاہت سے یک طرفہ آزادی کا اعلان کیا اور انہوں نے ایک طویل مباحثے کے بعد باہمی طور پر 1781ع میں ایک مشترکہ آئین کے تحت دنیا کی پہلی رسمی کنفیڈریشن کی بنیاد رکھی۔ گو کہ تھامس جیفرسن جیسا دانشور اور ماہرِ قانون اس آئین کا مصنف تھا لیکن ان 13 ریاستوں نے اس دستور کے اتفاق رائے تک پہنچنے میں جو تجاویز پیش کیں اور مراحل طے کیے، ان کو ''وفاقی دستاویزات'' (Federalist Papers) کے نام سے شایع شدہ ایک چھوٹی کتاب میں محفوظ کیا گیا ہے۔ وفاقیت کے نظام کی ارتقا اور بنیادوں کے اعتبار سے یہ ایک بنیادی دستاویز ہے۔ کنفیڈرل نظام 13 امریکی ریاستوں کے مابین تنازعات کو حل کرنے میں ناکام رہا، کیونکہ کنفیڈریشن میں آزاد اور مکمل طور پر خودمختار ریاستیں شامل ہوتی ہیں اور مرکز کا کوئی مؤثر اور فعال کردار نہیں ہوتا۔ اس لیے جلد ہی انہیں محسوس ہوا کہ شاید کنفیڈرل نظام ان کے تنازعات کے حل میں مؤثر کردار ادا نہیں کر سکے گا، کیوں کہ کنفیڈرل نظام میں مرکزی حکومت بہت ہی محدود ہوتی ہے اور اس کی وحدتیں مکمل طور پر آزاد اور خودمختار ہوتی ہیں، اس لیے ان تلخ تجربات کی روشنی میں آٹھ سالوں کے اندر یعنی 1789ع میں ہی امریکہ کو دنیا کی پہلی آئینی وفاقی جمہوریہ میں تبدیل کیا گیا۔ سوا دو سو برس گذرنے کے باوجود امریکہ کا وفاقی آئین آج بھی وہی ہے، جس میں اب تک 27 ترامیم ہو چکی ہیں۔

وفاقیت کے نظام کی کوئی ایک عالمگیر یا متفقہ وصف نہیں ہو سکتی، البتہ کچھ بنیادی وصفوں کے باوجود کچھ متفقہ اُصول ضرور وضع کیے جا چکے ہیں، جن کی رو سے کسی بھی ملک اور معاشرے میں اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے وفاقی نظام تشکیل پاتا ہے۔

اٹھارویں صدی میں دو بڑے واقعات یعنی 1789ع میں امریکی وفاقی آئین اور دنیا کی پہلی وفاقی ریاست کا قیام اور اسی سال یورپ میں آنے والا پہلا بورجوا جمہوری انقلاب، جسے ''فرینچ انقلاب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جدید انسانی تاریخ کا سنگِ میل ثابت ہوئے۔ ان کے نتیجے میں قومی سوال کو سمجھنے، قومی ریاستوں کے قیام اور کثیر القومی ریاستوں میں قومی سوال یا تنوع (Diversity) کے تضاد کو حل کرنے کی طرف بنیادی آئینی، سیاسی اور فکری اقدام اُٹھائے گئے۔ ہابس، روسو، کانٹ اور تھامس جیفرسن اس کے پہلے نقیب تھے، سماجوادیت اور مارکسی سماجوادیت اور کمیونزم کا دَور اس کے بعد آیا۔ ان انقلابوں اور تاریخی پیش قدمیوں کا ہی نتیجہ تھا کہ 19ویں صدی میں بھی مختلف خطوں میں وفاقیت کی لہر اُٹھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مثلاً 1848ع میں مختصر خانہ جنگی کے بعد یورپ کے 82 لاکھ آبادی کے حامل خوبصورت ملک سوئٹزرلینڈ نے خود کو آئینی طور پر ایک کنفیڈریشن کی شکل دی، جو کہ نہ صرف آج تک قائم ہے بلکہ وہ اس وقت دنیا کا واحد ملک ہے، جہاں پر کنفیڈرل نظام رائج ہے اور نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ ویسے آئین سے قطع نظر یورپ کا یہ چھوٹا سا ملک دنیا کا واحد ملک ہے جہاں 1848ع سے بھی پہلے گذشتہ پانچ سو سال تک یہ نظام مختلف صورتوں اور عدم مرکزیت کی صورت میں رائج رہا، لیکن آئینی طور پر یہ نظام 1848ع میں رائج ہوا۔ 1867ع میں کینیڈا ایک وفاقی ملک کے طور پر سامنے آیا، یہ الگ بات ہے کہ ابتدا میں اس کا نظام بدترین اختیارات کی مرکزیت کا حامل تھا اور ملک کے اندرونی تنازعات اور تنوع کے پیشِ نظر اب وہ دنیا کے اُن چند وفاقی ممالک میں سے ایک ہے، جہاں پر صوبوں کو آئینی طور پر حقِ علحدگی بھی حاصل ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ آج وہاں پر انگریزی-فرینچ یا اونٹیرو-کیوبیک تضاد کی شدت ماضی کی نسبت کم نظر آتی ہے۔ کینیڈا بھی امریکہ کی طرح ایک ایسا ملک تھا جہاں یورپ کے مختلف علاقوں سے آکر آباد ہونے والے گوروں نے مقامی نسلوں جنہیں عرفِ عام میں ریڈ انڈینز کہا جاتا ہے، کی نسل کشی کر کے ان

علاقوں پر صدیوں پہلے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ دونوں ممالک یورپ سے آئے ہوئے مہاجرین کے مقبوضہ علاقے تھے۔ اور اب جو نئے تضاد وفاقیت یا کنفیڈرل نظام میں حل کیے جا رہے تھے وہ مقامی اصلی باشندوں یعنی ریڈانڈینز اور یورپینز کے درمیان تھے۔ جس زمانے میں امریکہ اور کینیڈا میں وفاقی یا کنفیڈرل دساتیر کے ذریعے سیاسی نظام تشکیل دیے جا رہے تھے، تب تک مقامی ریڈانڈیز کی نسل کشی کی جا چکی تھی، جو کہ تاریخ کا ایک بڑا المیہ ہے۔ تاریخ کا المیہ یہ بھی ہے کہ اس تنوع میں باقی بچے ہوئے مقامی ریڈانڈینز یا افریقی غلاموں کو شمار نہیں کیا گیا تھا۔ کینیڈا چونکہ بڑا عرصہ نسلی اور لسانی تنازعات کا گڑھ رہا ہے، اس لیے وہاں ان تنازعات کو کیسے حل کیا گیا، یہ ایک دلچسپ کیس اسٹڈی ہے۔ 1871ع میں جرمنی یورپ کا دوسرا ملک تھا جس نے وفاقی نظام کو آئینی طور پر اختیار کیا۔ سئٹزرلینڈ کی طرح جرمنی کی وفاقی تاریخ بھی قدیم ہے اور وسطی دؤر کے رومن سلطنت کے دؤر سے اس کی بنیادیں ملتی ہیں۔ چونکہ انقلابِ فرانس نے یورپ میں ایک سیاسی طلاطم برپا کر دیا تھا، اس لیے 19ویں صدی میں جرمنی بھی ان تبدیلیوں سے بچ نہ سکا۔ 1871ع میں ویسٹ فیلیا (Peace of Westphalia) کے امن معاہدے کی روشنی میں جرمنی میں بھی ایک وفاقی آئین کے تحت ایک نئی جرمن وفاقی سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی۔ 1871ع سے لے کر مسلسل تبدیل اور عدم مرکزیت کا حامل ہونے کے باعث اس وقت دنیا میں جرمنی کا وفاقیت کا ماڈل بہت کامیاب ہے۔

اسی طرح 20ویں صدی کی ابتدا ہی 1901ع میں آسٹریلیا کے ایک وفاقی ریاست کے قیام سے ہوئی۔ آسٹریلیا 18ویں اور 19ویں صدیوں کی 6 وفاقی ریاستوں (امریکہ - 1789ع، میکسیکو — 1828ع، سئٹزرلینڈ - 1848ع، کینیڈا - 1867ع، جرمنی — 1871ع اور برازیل — 1891ع) کے بعد دنیا کی ساتویں وفاقی مملکت تھی، جو برطانوی بادشاہت کے ماتحت آج بھی ایک آئینی بادشاہت کی صورت میں موجود ہے، جب کہ اس کا سیاسی نظام مکمل طور پر وفاقیت اور جمہوریت کا حامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پئسفک خطے کے بڑے ملک آسٹریلیا کی داستان بھی ویسی ہی پر ماریت پر مبنی ہے، جیسی امریکہ اور کینیڈا کی ہے، کیونکہ یہاں بھی گورے یورپی پناہ گیروں نے مقامی آبادی ''ایب اوریجنز'' (Aboriginis) کی مکمل

نسل کشی کر کے اس خطے پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تینوں ممالک استعماریت کی پیداوار تھے، جو بعد میں یورپی نزاد تنوع اور تکثریت کی وجہ سے ابھرنے والے تنازعات اور متضاد علائقائی مفادات کی وجہ سے وفاقیت اور کنفیڈ ریشن کے نظاموں کی طرف راغب ہوئے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ آسٹریلیا بھی امریکا اور کینیڈا کی طرح تارکینِ وطن کی طرف سے آباد کردہ ایسا ملک ہے جہاں یورپی گوروں نے مقامی آبادیوں کی نسل کشی کی اور بعد میں اپنے باہمی تنازعات کو کم کرنے اور ملکی نظام چلانے کے لیے وفاقیت کے نظام کو اختیار کیا۔ آسٹریلیا میں تنوع کا مسئلہ شروع سے پیچیدہ رہا ہے، جس کو بتدریج آئینی اصلاحات سے حل کرنے کی کوشش کی گئی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد وفاقیت کے نظام کی مقبولیت کا یہ گراف اور بلند ہوا اور بیلجم بیسویں صدی کی تاحال آخری وفاقی ریاست ہے، جو کہ ایک نئے آئین کے تحت 1993ع میں از سرِ نو وجود میں آئی۔ بیلجم یورپ کی وہ وفاقی مملکت ہے جو بڑے زمانے سے نسلی اور لسانی تنازعات کی وجہ سے مسلسل بحرانات کا شکار رہی ہے، جس کو بڑی حد تک اسی آئین کی رو سے حل کیا گیا ہے، لیکن ایسے تنازعات حتمی طور پر حل ہونے میں بہت وقت لیتے ہیں۔ چونکہ بیلجم میں فرینچ اور فلیمش تضاد سنگین تنازعات کا شکار رہا ہے، اس لیے اس وفاقی نظام کا بنیادی نقطہ یہ ہی رہا ہے۔ بیلجم کا وفاقی ڈانچہ دو قطبی (Zonal) نوعیت کا حامل ہے۔ گو کہ دنیا میں امریکہ کنفیڈ ریشن سے وفاقیت کی جانب بڑھا اور ملک کے اپنے انتظامی اور علائقائی تنوع کے معاملات کو حل کیا، سئٹزرلینڈ کے زیرِانتظام وفاقی ڈانچہ کام آرہا ہے۔ بیلجم شاید جدید دؤر کی واحد ایسی فیڈ ریشن ہے جو اب تک مکمل طور پر تنوع کے تضادات کو حل نہیں کر سکی اور غالب گمان ہے کہ مستقبل میں یہ ملک فیڈ ریشن سے کنفیڈ ریشن کی جانب گامزن ہو۔

یہ الگ بات ہے کہ اب دنیا میں یہ رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے، جس کی مثال نیپال اور سریلنکا کی جانب سے حال ہی میں وفاقی آئین کی تشکیل کے لیے ہونے والی آئینی کوششیں ہیں۔ ویسے بھی تنازعات کے بعد کثیر القومی ریاستوں اور معاشروں میں ایک پرامن مستقبل اور باہمی رضامندی پر مبنی نظام کے حوالے سے وفاقیت کو ایک موزوں نظام سمجھا جاتا ہے۔

اس وقت دنیا میں اقوام متحدہ کے 194 ممالک ممبر ہیں، جن میں سے صرف 28 مملکتیں وفاقی ہیں، جن میں ارجنٹینا، آسٹریلیا، بیلاؤ ، بیلجم، بوسنیا ہرزگووینیا، برازیل، کینیڈا، کاموروس، کانگو، ایتھوپیا، جرمنی، انڈیا، عراق، ملائیشیا، میکسیکو، مائکرونیشیا، نائجیریا، پاکستان، روس، سینٹ کٹس اور نیوس، جنوبی افریقا، اسپین، سوڈان، سوئٹزرلینڈ، متحدہ عرب امارات، امریکہ اور وینزویلا شامل ہیں۔ گو کہ دنیا کے اندر تعداد کے لحاظ سے وفاقی ممالک کی تعداد کم ہے لیکن آج بھی دنیا کی سات ارب سے زائد آبادی میں سے تقریباً 42 فیصد آبادی ان ہی 28 ممالک میں مقیم ہے، جو آئینی طور پر وفاقیت کے نظام کے حامل ہیں، اُن میں سے صرف دو ممالک ایسے ہیں جن کی مثال عجیب اور دلچسپ ہے، یعنی انڈیا آئینی طور پر ایک یونین* ہے لیکن عملی طور پر وہاں پر وفاقی نظام رائج ہے اور متحدہ عرب امارات آئین اور جمہوریت کے بغیر بھی ایک کامیاب وفاقی ملک ہے۔ اگرچہ دنیا میں وفاقی نظام کی فعالیت اور کامیابی کے لیے جمہوریت کو ایک لازمی عنصر کے طور پر لیا جاتا ہے، لیکن چونکہ عدم مرکزیت، وفاقی وحدتوں کی مکمل خود مختاری اور تنوع کا احترام اور تحفظ وفاقیت کے بنیادی اُصول اور تقاضے مانے جاتے ہیں، اس لیے متحدہ عرب امارات صرف ان دو شرائط پر عمل درآمد کرنے کی وجہ سے ایک کامیاب وفاقی ملک کے طور پر چل رہا ہے۔ اس مثال سے یہ ثابت ہے کہ وفاقی نظام جمہوریت کے بغیر تو چل سکتے ہیں لیکن عدم مرکزیت اور مکمل صوبائی خود مختاری اور تنوع کے احترام اور تحفظ کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ وفاقی نظام پر مذکورہ بالا تنقیدوں اور خدشات واعتراضات کے باوجود یہ نظام گذشتہ سوا دو سو سالوں سے دنیا میں بتدریج مقبول ہو رہا ہے۔

یہ سوال اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ آخر دنیا کے 194 ممالک میں سے صرف 28 ممالک نے ہی کیوں اس نظام کا انتخاب کیا؟ اس سوال کا آسان جواب یہ ہے کہ یہ نظام ہر معاشرے اور ریاست کے لیے موزوں نہیں ہے۔ وفاقیت کا نظام صرف اُن ممالک اور معاشروں کے لیے موزوں ہے جہاں پر

---

*یونین بھی آئینی طور پر وفاقی طرزِ حکومت کا نظام ہے، لیکن اس میں تمام ریاستی امور کے حوالے سے بنیادی اور حتمی اختیارات مرکز کو حاصل ہوتے ہیں۔ 18ویں آئینی ترمیم کے بعد پاکستان کے مقابلے میں ہندستان کا آئین زیادہ مرکزیت کا حامل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں جتنی بھی صوبائی خود مختاری صوبوں کو آئین میں دی گئی ہے، اس پر عمل ہوتا ہے اور پاکستان میں 18ویں آئینی ترمیم پر مکمل طور پر عملدرآمد نہیں ہو سکا ہے۔

کثیر القومی، متنوع یا تکثیریت کے حامل گروہوں اور مذہبوں یا زبانوں اور ثقافتوں کے لوگ اپنے اپنے دائروں میں ایک ساتھ بھی رہنا چاہتے ہیں اور اپنی خود مختار جداگانہ حیثیت اور تشخص کو بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ دنیا میں وفاقی نظام اختیار کرنے کے مجموعی طور پر بنیادی اسباب درج ذیل ہیں:

ا۔ معاشرہ اور ملک کثیر القومی، کثیر اللسانی اور کثیر المذہبی یا کثیر الثقافتی ہو۔

دنیا میں وہ ممالک جہاں یا تو آبادی بڑی ہو یا ایراضی، کیونکہ ایسے ممالک میں ملک کو انتظامی طور پر سنبھالنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ ایسے ممالک میں امریکہ، کینیڈا، برازیل، میکسیکو، ارجنٹائن، وینزویلا، اسپین، روس، جرمنی، نائجیریا، انڈیا اور پاکستان جیسے ممالک آتے ہیں۔

۳۔ مرکزیت پسند وحدانی (Unitary) نظام سے عدم مرکزیت کی طرف گامزن ممالک جیسا کہ ارجنٹائن، برازیل اور میکسیکو وغیرہ۔

۴۔ قومی تضاد کو آئینی طور پر حل کرنے والے ملک مثلاً بیلجیم، ایتھوپیا اور جنوبی افریکہ، سئٹزرلینڈ وغیرہ۔

۵۔ خانہ جنگی یا اندرونی شدید تضادات کے شکار رہنے والے ملک بوسنیا، کانگو، عراق، سوڈان اور جنوبی افریکا وغیرہ وغیرہ۔

پاکستان اور ہندوستان کی طرح کئی ممالک کو نوآبادیاتی راج کے خاتمے کے بعد یہ نظام ورثے میں ملا لیکن انہوں نے بعد ازاں اپنے معروضی حالات کے مطابق بنیادی اصلاحات کر کے نئے آئینی اور سماجی معاہدے کے تحت اس کی اپنی بنیاد ڈالی، یہ الگ بات ہے کہ پاکستان جیسی ریاستیں 70 برس گذرنے کے باوجود تاحال حقیقی وفاقی نظام نافذ کرنے سے نفسیاتی اور سیاسی طور پر انکاری ہیں۔

دنیا کے اندر وفاقی نظام کے اُصول عالمی طور پر یکساں ہیں لیکن چونکہ معاشرے اور ملک زندہ وجود اور حقائق کے حامل ہوتے ہیں لہٰذا وہ ان عالمی اُصولوں کو اپنے محرکات اور داخلی حقائق کے حساب سے نافذ کرتے ہیں۔ دنیا کے اندر اس وقت جو وفاقی ممالک کامیابی سے چل رہے ہیں اور انہوں نے اپنے اندرونی تضادات حل یا کم کر لیے ہیں، اس کی اصل وجہ ہی یہ ہے

کہ وہ وفاقیت کے حوالے سے اُن عالمی طور پر مستند اور تسلیم شدہ اُصولوں پر عمل پیرا ہیں اور بیک وقت دنیا کے اندر جو ممالک عالمی اُصولوں پر عمل سے انکار اور اس کی بدترین نفی کرتے رہے ہیں، وہ آج بھی بحران زدہ ہیں، جس کی ایک واضح مثال پاکستان بھی ہے۔ آیئے اُن عالمی اُصولوں پر مختصر روشنی ڈالیں:

(1) کسی بھی وفاقی ملک کے لیے لازمی ہے کہ اُس میں شامل ہونے والی وحدتیں یا وفاق کی تشکیل کرنے والی مشمولہ اکائیاں کسی عمرانی یا سماجی معاہدے یا ایک ساتھ ملکر رہنے پر راضی ہوں۔ لفظ فیڈرل ازم ایک لاطینی لفظ ''فوئیڈوس'' سے نکلا ہے، جس کے معنی اور جوہر دو یا یا دو سے زیادہ فریقین کے درمیان کوئی معاہدہ یا رضامندی ہے۔ اس لیے یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ وفاقیت کے نظام میں کسی بھی قوم یا گروہ کو طویل عرصے تک زبردستی یا ریاستی جبر سے ساتھ رکھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ کینیڈا میں کیوبیک، اسپین میں باسک اور کیٹلونیا، بیلجیم میں فرینچ اور فلیمش جیسے قومی تضاد اس کی چند مثالیں ہیں، جنہیں باہمی رضامندی اور ان کے حقِ خودارادیت کے اُصول سے حل کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں کہیں بھی اس وفاقی معاہدے یا ان اُصولوں کی نفی ہوتی ہے، وہاں مسائل، پیچیدگیاں اور تنازعات از سرِ نو اُبھر آتے ہیں، جس کی ایک واضح حالیہ مثال اسپین میں کیٹولیا کی ہے، جس نے یک طرفہ طور پر وفاق سے علحدگی کا اعلان کر دیا، جس نے نہ صرف اسپین بلکہ دنیا کی کئی وفاقی مملکتوں میں ایک بھونچال مچا دیا۔ یاد رہے کہ قوموں کے حقِ خودارادیت کا تصور امریکی صدر اور دانشور وڈرو ولسن نے دیا تھا۔ وڈرو ولسن سے پہلے مشہور جرمن فلسفی کانٹ نے بھی عالمی امن کے لیے قوموں کی برابری اور مکمل خودمختاری کے اصولوں اور عالمی امن کے سوال کو اس سے مشروط کیا تھا۔

(2) جیسا کہ پہلے ہی واضح ہوا کہ وفاقیت کا مطلب ہی جداگانہ شناختوں، مختلف اور بعض اوقات متضاد مفادات اور کئی ذیلی شناختوں کی حامل قومیتوں اور گروہوں کے درمیان ایک سماجی معاہدہ ہے (سماجی معاہدے پر یونان سے لیکر جدید دَور میں ہابس، جان لاک، کانٹ، مارکس، ہیگل، ووڈرو ولسن اور جان رالز وغیرہ نے اس کی تائید اور تنقید کے اعتبار سے بنیادی کام کیا ہے)، جس کی شکل کسی بھی وفاقی ملک کے اندر ایک وفاقی آئین ہوتا ہے، جو کہ اس

ریاست کو تشکیل دینی والی اکائیاں اور ان کے آئینی ایوان تشکیل کرتے ہیں۔ کچھ وفاقی ممالک مثلاً امریکہ، جرمنی وغیرہ میں تو خود اکائیوں کے اپنے جدا جدا دساتیر اور حتیٰ کہ مکمل عدالتی نظام اور ان کے پرچم بھی جدا ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی وفاقی ریاست کا آئین جتنا اپنی اکائیوں کے مفادات اور منشا کا آئینہ دار ہوگا وہ ملک اور آئین اس قدر حقیقی معنٰی میں وفاقی ملک کہلانے کا حقدار ہوگا۔

(3) جیسا کہ کسی بھی وفاقی ملک میں وفاق تاریخی قوموں یا مشمولہ اکائیوں کو جنم نہیں دیتے، کیوں کہ وہ پہلے سے ہی تاریخی طور پر موجود ہوتی ہیں لیکن دراصل مشمولہ اکائیاں کسی بھی وفاق کو تشکیل دیتی ہیں، اس لیے ظاہر سی بات ہے کہ ایک حقیقی وفاقی (پارلیمانی خواہ صدارتی) نظام عدم مرکزیت یا مکمل ریاستی/ صوبائی خود مختاری پر مبنی ہوتا ہے۔ یعنی صوبوں کو صوبائی یا بین الصوبائی معاملات میں بنیادی فیصلے سازی کے عمل میں وفاق پر سبقت حاصل ہوتی ہے اور وفاق کی ذمہ داری صرف بین الصوبائی یا بین الحکومتی معاملات کی نگہبانی ایک ثالث کے طور پر کرنا ہوتی ہے اور وہ بھی صوبوں کی مرضی سے۔ یہاں تک کہ صوبوں کی حدود میں ردوبدل کا اختیار بھی وفاق کی بجائے متعلقہ صوبوں کو حاصل ہوتا ہے۔ (پاکستان کے برعکس انڈیا ایک ایسا ملک ہے، جہاں یہ حق صوبوں کی بجائے صرف مرکز کو حاصل ہے، کیونکہ بنیادی طور پر انڈیا ایک یونین ہے، آئینی طور پر وہ ایک وفاقی ملک نہیں ہے۔ 50ع کی دہائی میں جب انڈیا میں صوبے بنائے گئے تھے تو وہاں اس کام کو سرانجام دینے کے لیے وقتی طور پر ایمرجنسی نافذ کرکے آئین کو عارضی طور پر معطل کیا گیا تھا، صرف انڈیا نہیں بلکہ نائجیریا، جرمنی اور بہت سے وفاقی ممالک میں یہی طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا، کیونکہ صوبوں کی حدود میں ردوبدل ہمیشہ وفاقی نظام میں سب سے مشکل معاملہ ہوتا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ صوبے وفاقی تشکیل سے قبل مخصوص قومیتوں یا آبادیوں کے ایک تاریخی وطن کی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں اور وہاں کی مقامی آبادیاں صوبوں کی تقسیم کو اپنے تاریخی وطنوں یا علاقوں کو تقسیم کرنے سے مترادف سمجھتی ہیں، اور اس حوالے سے بہت حساس بھی ہوتی ہیں۔ پاکستان میں اس کی ایک مثال صوبہ سندھ ہے۔) جس وفاقی نظام میں صوبے مکمل طور پر

خود مختار حیثیت کے حامل نہیں ہوتے اسے وفاقی نہیں بلکہ وحدانی طرزِ حکومت (Unitary System) کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں برطانوی آئین 1935ع کی طرح پاکستان میں وفاقیت کے نام پر زیادہ تر وحدانی طرزِ حکومت کا نظام رائج رہا ہے اور پاکستان کا ہمہ گیر ریاستی بحران اسی کا منطقی نتیجہ ہے۔

(4) دنیا کے ہر وفاقی ملک میں صوبوں کے درمیان آبادی کا عدم توازن ہوتا ہے۔ مثلاً بھارت میں ایک ریاست اُتر پردیش پورے پاکستان سے بڑی ہے۔ سئٹزرلینڈ میں جرمن زبان بولنے والے 80 فیصد سے زائد ہیں، بیلجم میں فرنچ کی بنسبت فلیمش آبادی کی اکثریت ہے، یہاں تک کہ پاکستان میں اس وقت بلوچستان کی آبادی 5.3 فیصد (43 فیصد ایراضی ہونے کے باوجود) ہے، دوسری جانب صرف پنجاب کی آبادی 57 فیصد ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آبادی کا یہ عدم توازن وفاقیت کے نظام میں آخر کس طرح حل کیا جائے؟ یہ ہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر وفاقی ملک میں مرکزی پارلیمنٹ کے دو ایوان (Bi-cameral Legislature) ہوتے ہیں اور اُن میں صوبوں یا ریاستوں کے مساوی نمائندگی کے حامل ایوان یعنی سینیٹ کو تمام وفاقی معاملات میں حتمی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ہی اسے بالائی ایوان کہا جاتا ہے۔ پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ 1947ع کے آزادی کے ایکٹ، 1956ع اور 1962ع کے دساتیر میں یہ ایوان موجود ہی نہیں تھا اور 1973ع کے بعد برائے نام موجود تو ہے لیکن ہنوز بے اختیار ہے۔ سینیٹ کی طاقتور اور بالائی اور حتمی حیثیت سے وفاق کی آبادی کے لحاظ سے چھوٹی اکائیوں کو یقین اور احساسِ تحفظ ہوتا ہے کہ اگر ایوانِ زیریں میں بڑے یا بالادست صوبے کی اکثریت ہے تو وفاق کے نمائندہ بالائی ایوان کو بھی حتمی اختیارات حاصل ہیں اور اس طرح انہیں احساسِ تحفظ ہوتا ہے۔ پاکستان میں سینیٹ بنیادی امور پر صرف مشورے دے سکتا ہے یا بحث مباحثے کر سکتا ہے، کیوں کہ مالیاتی معاملات وہاں پیش نہیں کیے جاتے۔ یا وفاقی اور بین الصوبائی یا بین الحکومتی امور میں سینٹ کو حتمی اور فیصلہ کن اختیارات حاصل نہیں ہیں۔

(5) وفاقی نظام میں قدرتی وسائل مکمل طور پر صوبائی معاملہ ہوتا ہے، جس میں سے وفاق کو صرف صوبوں کی جانب سے مختص کردہ ایک مالیاتی حصہ ملتا ہے، کسٹم وغیرہ کے علاوہ تمام بڑے ٹیکس صوبوں کے پاس ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات کہ صوبوں کو سیاسی خودمختاری کے ساتھ ساتھ مکمل طور پر مالیاتی خودمختاری (Fiscal Autonomy) بھی حاصل ہوتی ہے۔ پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں پر مالیاتی امور بھی مرکزیت کا شکار رہے ہیں، جس نے مالیاتی استحصال کی بدترین مثالیں قائم کی ہیں۔

(7) جیسا کہ میں نے ذکر کیا کہ وفاقیت کے نظام میں عدم مرکزیت کا ہونا لازمی ہے، اس لیے مکانی حکومتیں بھی دنیا میں وفاقیت کا لازمی جُز سمجھی جاتیں ہیں لیکن ایک تو وہ آئینی طور پر مرکز کی بجائے صوبوں کے ماتحت ہوتی ہیں اور دوسرا ان کے اختیارات شہری سہولیات کی فراہمی تک محدود ہوتے ہیں، انہیں آئینی اور سیاسی اختیارات حاصل نہیں ہوتے۔ سندھ میں متحدہ قومی موومنٹ عرصہ دراز سے کراچی کی شہری حکومت کے لیے صوبائی حکومت کے برابر یا اس سے قطع نظر قانونی، سیاسی، مالیاتی اور انتظامی اختیارات کا مطالبہ کرتی رہی ہے، جو کہ دنیا میں سٹیٹز رلینڈ کی مقامی حکومتوں کے علاوہ اور کسی ملک میں کسی بھی مکانی حکومت کو حاصل نہیں۔ لیکن سٹیٹز رلینڈ میں یہ نظام شہریت کے اُصول کے تحت قائم ہے، وہاں کسی ایک گروہ کی اجارہ داری نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی تصور موجود ہے، حتیٰ کہ 80 فیصد سے زائد شرح کی حامل آبادی یعنی جرمن بھی اس کا تصور نہیں کر سکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں صوبوں یا اضلاع اور تحصیلوں کے برعکس کنفیڈریشن کی آئینی وحدتیں کینٹنز (Cantons) ہوتے ہیں۔ اس لیے کینٹنز کی آئینی خودمختاری دراصل کنفیڈریشن کی مشمولہ وحدتوں کی خودمختاری ہوتی ہے۔ سندھ میں کراچی کے حوالے سے متحدہ قومی موومنٹ تمام شہریوں کے لیے نہیں بلکہ اپنی اجارہ داری کے لیے کراچی کی شہری حکومت کے لیے صوبائی حکومت کے برابر بلکہ اسے بھی زائد اختیارات کا مطالبہ کرتی رہی ہے اور سندھ میں 2012ع کا متنازع لوکل گورنمنٹ ایکٹ اس کی ایک بدترین صورت تھا، جس میں سندھ میں دوہرا مکانی حکومتوں کا نظام وضع کیا گیا تھا، جس کو بعد میں عوام کی شدید مخالفت کے بعد 2013ع کے انتخابات سے پہلے واپس لے لیا گیا تھا۔

پاکستان میں جمہوری اور حقیقی وفاقی کلچر اور نظام کمزور ہونے کی وجہ سے مکانی حکومتوں کی اہمیت کو کبھی بھی سمجھا نہیں گیااور نہ ہی اس پر عمل کیا گیا۔ بد قسمتی کی بات یہ بھی ہے کہ ایک طرف جہاں آمریتوں نے تو اس نظام کو 1959ع، 1979ع اور 2001ع میں پارلیمنٹ کو کمزور بناتے ہوئے اپنے ناجائز مفادات میں استعمال کیا لیکن ملک کی کسی بھی منتخب جمہوری حکومت نے اس نظام کو مطلوبہ اہمیت نہیں دی، جس کے نتیجے میں عدم مرکزیت کا سوال اور خواب آج بھی تشنہ تعبیر ہے اور نتیجے میں ملک میں وفاقی نظام کی بنیادیں کبھی بھی مضبوط ہ نہ ہو سکیں۔

(8) وفاقی نظام کا جواز ہی چونکہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں پر مختلف قوموں، ثقافتوں، مذہبوں اور زبانوں یا معاشی مفاد کے حامل لوگوں کا تنوع ہوتا ہے لہٰذا وفاقیت کا حقیقی نظام ریاست کو کثیر القومی حیثیت میں تسلیم کرتا ہے، تمام مذاہب، ثقافتوں اور زبانوں کا یکساں احترام اور تحفظ کیا جاتا ہے اور معاشرے میں مساوات پیدا کرنے کے لیے یکسانیت (Uniformity) کی بجائے تنوع (Diversity) کا احترام اور تحفظ کیا جاتا ہے۔ پاکستان کا المیہ یہ بھی ہے کہ یہاں پر 70 سال سے زائد عرصہ گذرنے کے باوجود اردو زبان کو بطور واحد قومی زبان پورے ملک پر ناجائز طور پر مسلط کیا گیا ہے اور ایک اقلیتی کلچر کو قومی کلچر اور لباس قرار دیا گیا ہے، جب کہ پاکستان ہزاروں سال قدیم تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کی حامل اقوام اور وطنوں اور عوام کا آئینی الحاق ہے لیکن اُن کی تاریخی زبانوں، ثقافتوں، خود مختار وجود اور خودارادیت کا احترام نہیں کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کو ایک رابطے کی زبان کا درجہ دے کر اگر ملک کی قومی زبانوں جیسا کہ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی اور دیگر زبانوں کو قومی زبانوں کا درجہ دیا جائے تو اس سے ملک میں لسانی تضادات ختم ہو سکتے ہیں، ملک میں اردو کی واحد قومی حیثیت نے خود اردو کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے، کیوں کہ ایک حَسین اور امیر زبان کو بلاوجہ متنازعہ بنادیا گیا ہے۔ وفاقیت کے اُصولوں کی روشنی میں تمام زبانوں، ثقافتوں اور شناختوں کو جائز اور برابر حیثیت دے کر ملک میں ثقافتی اور لسانیاتی تنازعات کو بخوبی حل کیا جاسکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ ملک میں جمہوریت یا بے شمار تضادات کو وفاقیت کے مذکورہ بالا زیرِ بحث آنے والے اُصولوں کی کسوٹی پر رکھ کر ان کے حل بھی ان اُصولوں کی روشنی میں تلاش کیے جائیں۔اس میں ایک مضبوط اور بہتر پاکستان کا مستقبل محفوظ ہو سکتا ہے۔

پاکستان میں وفاقیت کیوں؟

مذکورہ بالا بحث میں دنیا کے اندر رائج وفاقیت کے نظام کی تاریخ، تقاضوں اور بنیادی اُصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آیئے اب اس ضمن میں پاکستان میں ریاست کے بحران اور وفاقیت کی نفی کی تاریخ کا ذکر کرتے ہیں۔ کیوں کہ وفاقیت کے بنیادی اُصولوں کے بغیر پاکستان میں ریاست کے بحران کو سمجھنا ممکن نہیں۔ پاکستان میں وفاقیت کی نفی کی تاریخ کے کچھ بنیادی نکات پر روشنی ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ اس ملک کا بنیادی مسئلہ کیا ہے؟ ریاستیں اور معاشرے بھی سیاسی طور پر زندہ یعنی نامیاتی (Organic) وجود کے حامل ہوتے ہیں، اگر ان کے بنیادی اُصولوں کی نفی کی جائے گی اور ان کو عقل، شعور، معروضیت، سماجی انصاف اور مساوات خواہ تغیر کے اُصولوں کی نفی کی بنیاد پر چلانے کی کوشش کی جائے گی تو پھر اُن کے داخلی بحرانات ناگزیر ہو جاتے ہیں، پاکستان اس کی ایک زندہ مثال ہے۔

یوں تو پاکستان کی پوری تاریخ وفاقیت کے بحران سے بھری ہوئی ہے لیکن کبھی کبھار کچھ مواقع پر یہ بحران اور تضادات آئینی، سیاسی، ثقافتی اور معاشی طور پر زیادہ شدت سے سامنے آ جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر سیاسی بحران پر سطحی بحث مباحثہ تو ہوتا ہے لیکن اس ہمہ گیر بحران کو وفاقیت کے نظام کے اُصولوں کے تحت دیکھنے، پرکھنے اور نتائج اخذ کرنے کی کوشش پاکستان کی تاریخ میں بہت ہی کم ہوئی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ پاکستان میں دانشورانہ انحطاط کے باعث ریاست اور سیاست کے معاملات کو علمی، فکری اور نظریاتی بنیادوں پر زیرِ غور لانے کی روایت پاکستان میں بہت کمزور ہو چکی ہے۔ فکر انگیز تجزیات کی جگہ اب سطحی تبصروں نے لے لی ہے اور یہ ہی کارپوریٹ میڈیا کا مزاج بھی ہے اور ریاست کا مفاد بھی اس میں مضمر ہے۔ کیونکہ کارپوریٹ میڈیا کے سطحی تبصروں سے ریاستی بیانیے کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اٹھارویں آئینی ترمیم کو گو کہ ایک عرصہ گذر چکا ہے لیکن ابھی تک اس پر مکمل طور پر عمل نہیں ہو سکا، جس کے لیے وفاقی اور صوبائی حکومتیں برابر کی ذمہ دار ہیں۔ کئی مواقع پر اسے واپس لینے یا کچھ شعبہ جات مثلاً تعلیم اور صحت وفاق کو واپس دینے کی باتیں بھی ہوتی رہتی ہیں، جس پر میاں رضا ربانی اپنا سخت رد عمل بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ میرے خیال میں پاکستان میں وفاقیت کے بحران اور موجودہ تنازعات پر بات کرنے سے قبل بہتر ہوتا کہ وفاقیت کے نظام کے بارے میں پیچیدگیاں اور غلط فہمیاں دور کی جائیں اور پھر شاید ان اُصولوں کی روشنی میں پاکستان کے ریاستی، آئینی اور قومی تضادات کو سمجھنا نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ پاکستان میں المیہ یہ بھی ہے کہ ایک طرف ریاست کا بیانیہ وفاقیت کے اُصولوں کے برعکس ہے تو دوسری طرف جو جماعتیں ملک میں وفاقی ہونے کی دعویدار ہیں، وہ بھی وفاقیت کے حقیقی اُصولوں، اقدار اور نظام کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور یہ ہی حال ملک کی قوم پرست جماعتوں کا ہے جو سمجھتی ہیں کہ ملک میں چھوٹی قومیتوں کے ساتھ امتیازی اور تفریق آمیز سلوک کے پیچھے وفاقیت کے نظام کا ہاتھ ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا بنیادی سبب وفاقیت کا نظام نہیں بلکہ اس کی انحرافی ہے۔ المیہ یہ بھی ہے کہ ملک کے عوام تو اپنی جگہ لیکن سیاسی جماعتیں، میڈیا اور جامعات کے اساتذہ کی اکثریت بھی وفاقیت کے اُصولوں اور اقدار کو درست تناظر میں نہیں دیکھتے اور سمجھتے۔

اس بحث سے قطع نظر کہ پاکستان کا قیام یا برِ صغیر کی تقسیم درست تھی یا نہیں؟ بہر حال 1947ع میں ملک کا قیام 47ع کے آزادی ایکٹ کے تحت عمل میں آیا، جو کہ دراصل 1935ع کے برطانوی اور نوآبادیاتی آئین کی بنیاد پر تشکیل کیا گیا تھا۔ 1935ع کا آئین اپنی تمام کمزوریوں اور مرکزیت پسندی کے باوجود ایک نیم وحدانی طرز کا وفاقی آئین تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وفاقیت کا وہ ماڈل نوآبادیاتی راج کے سامراجی مفادات کا آئینہ دار تھا۔ کیوں کہ حقیقی وفاقیت کا نظام قوموں یا آئینی اکائیوں کی مکمل خود مختاری پر مبنی ہوتا ہے اور برطانوی سامراجی آئین تمام تر نوآبادیاتی دساتیر کی طرح سخت مرکزیت پسند تھا۔ اس کے باوجود وہ آئینی ڈھانچہ پاکستان اور ہندوستان کو بطور عبوری آئین کے دیا گیا، جسے تبدیل کرنے کا عبوری اختیار گورنر

جنرل یعنی محمد علی جناح صاحب کو حاصل تھا۔ اُصولی طور پر وہ اختیار آئین ساز اسمبلی کو حاصل ہونا چاہیے تھا، جس کے اجلاس 10، 11 اور 12 اگست کو مشرقی بنگال کے رکن اور ہندوؤں کے نچلے طبقات کے رہنما جوگندر ناتھ منڈل کی زیرِ صدارت ہوئے، جن کو اسمبلی کا عارضی صدر چنا گیا تھا، (بعد میں وہ جناح صاحب کی تشکیل کردہ پہلی کابینہ میں وزیرِ قانون بھی رہے) لیکن وہ اسمبلی ملک کے لیے کسی آئین کی تشکیل میں ناکام رہی۔ میرے خیال میں پاکستان کے اندر ریاست کے بحران کو وفاقیت کے اُصولوں کی نفی کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے اور اس ضمن میں درج ذیل نکات انتہائی اہم اور بنیادی ہیں۔

(1) برِ صغیر کی سیاسی اور وفاقی تاریخ کا یہ ایک عجیب تضاد ہے کہ جس جناح صاحب نے برطانوی دساتیر پر اور خصوصاً 1935ع کے آئین پر سب سے زیادہ آئینی اعتراضات کیے تھے، انہوں نے نہ صرف اسی آئین کو ملک کے عبوری آئین کے طور پر قبول کیا بلکہ جب انہیں بطور گورنر جنرل اس عبوری آئین کو تبدیل کرنے کا آئینی اختیار حاصل تھا پھر بھی انہوں نے اس کو تبدیل نہیں کیا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کے قیام کے بعد مسلسل علالت میں رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بسترِ علالت سے بھی یہ کام کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ ایک جید وفاقی سیاستدان کے ساتھ ساتھ ایک صفِ اول کے قانونی اور آئینی ماہر بھی تھے۔ یا تو وہ اپنی وفات سے قبل اس عبوری آئین کو حقیقی وفاقی آئین میں تبدیل کرتے یا ایک مکمل نیا خاکہ پیش کر جاتے، جس کو بنیاد بنا کر ملک کا پہلا وفاقی پارلیمانی دستور تشکیل ہو پاتا، لیکن افسوس کہ ان کی پاکستان کے قیام کے بعد کی ایک سالہ زندگی میں یہ نہ ہو سکا اور پھر ملک کی سمت کا تعین ان لوگوں نے کیا جن کو انہوں نے ''کھوٹے سکے'' کہا تھا، میری مراد رجعت پسند گروہ کے سربراہ لیاقت علی خان سے ہے، جنہوں نے جناح صاحب کی 11 اگست کی سیکولر تقریر کو پسِ پُشت ڈال کر 1949ع میں ملک کو ایک مذہبی ریاست میں تبدیل کر دیا۔ دنیا کی کوئی بھی مذہبی ریاست حقیقی معنوں میں نہ تو جمہوری ہو سکتی ہے اور نہ وفاقی، کیونکہ مذہبی ریاست معاشرے کے تنوع اور تکثریت کو رد کرتی ہے اور ریاستی سطح پر ایک مذہب اور اس کے حامل گروہ کی اجارہ داری کو یقینی بناتی ہے۔

(2) جناح صاحب کا دوسرا تضاد یہ ہے کہ انہوں نے ملک کے قیام کے فوراً بعد ڈھاکا اور کوئٹا میں جا کر بار بار یہ دہرایا کہ ملک کی قومی زبان صرف اردو ہو گی۔ حالانکہ ان کو بخوبی معلوم تھا کہ پاکستان ایک کثیر القومیتی، کثیر السانی اور کثیر المذہبی معاشرہ ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی کہ ملک میں شامل ہونے والی تاریخی وحدتیں اور قومیتیں اپنی زبانوں اور ثقافتی اور تاریخی شناختوں کے حوالے سے بہت حساسیت کی حامل ہیں۔ یہاں یا کسی بھی وفاقی معاشرے اور ملک میں لسانی وحدانیت اور یکسانیت کا غلط تجربہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس جناح صاحب نے 1924ع میں سب سے پہلے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندوستان کو ایک وفاقی پارلیمانی نظام چاہیے، وہ 1948ع میں یہ بات سمجھنے سے کیوں قاصر رہے کہ دنیا کے کسی بھی وفاقی ملک میں کسی واحد قومی زبان کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ رابطے کی زبان (Lingua Franta) ایک یا ایک سے زیادہ تو ہو سکتی ہیں لیکن کسی بھی کثیر القومی وفاقی ملک میں واحد قومی زبان نہیں ہو سکتی، اور وہ بھی ملک کی 3 فیصد آبادی کی مادری زبان۔ ہندوستان میں 22 قومی زبانیں ہیں، نائجیریا میں تین، ایتھوپیا میں دو دفتری اور 11 قومی زبانیں، جنوبی افریکا میں دو، سئٹزرلینڈ میں چار، بیلجیم میں دو، کینیڈا میں دو اور اسپین میں کیسٹیلین، باسط اور گیلیشین قومی زبانیں ہیں۔ جناح صاحب کی یہ پالیسی ملک میں ثقافتی تنوع کی نفی اور ثقافتی وحدانیت اور مصنوعی یکسانیت کے غیر وفاقی اور خود فریب نظریے اور ریاستی نقطہ نظر کا سنگِ میل ثابت ہوئی۔ جس کے نتیجے میں ملک میں ثقافتی اور قومی تضاد اور شدید ہوا اور بنگال کی علحدگی کی بنیاد بھی گویا اس دن ڈھاکا میں ڈالی گئی جس دن 1948ع میں جناح صاحب نے اردو کو یکسر طور پر قومی زبان بنانے کا اعلان کیا۔ حالانکہ اردو کو رابطے کی زبان اور وفاق کی وحدتوں کی زبانوں کو قومی زبانوں کا درجہ دے کر ملک میں ابتدا ہی سے لسانی تنازعات کا خاتمہ کیا جا سکتا تھا۔ کثیر لسانی معاشروں میں لسانی اجارہ داری ہمیشہ تنازعات کا باعث بنتی ہے۔

(3) جناح صاحب تقسیم سے قبل ہندوستان میں صوبائی خود مختاری اور اقلیتوں کے سب سے بڑے داعی اور وکیل تھے لیکن تاریخ کا عجیب المیہ ہے کہ انہوں نے ملک کے قیام کے بعد اس کی نفی کرنا شروع کر دی اور کہا کہ صوبائی خود مختاری کا یہ مفروضہ تو ہندوستان سے آزادی

حاصل کرنے کیے لیے بنایا گیا تھا۔ یہاں تک کہ تقسیمِ ہند سے پہلے صوبائیت کے سب سے بڑے علمبردار جناح صاحب نے پاکستان کے قیام کے بعد اس کو عصبیت سے تعبیر کیا۔

(4)1949ع میں ہندوستان نے اپنا پہلا اور آخری آئین تشکیل دیا لیکن پاکستان کے رجعت پسند سوچ کے حامل وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اسی سال پاکستان میں اسمبلی سے ''قراردادِ مقاصد'' پاس کروائی۔ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ ملک کے قیام کے تین سالوں تک ملک کے مقاصد طے کئے جاتے رہے اور آج تک ملک نے اس سیکولر تصور کو ملک کی نظریاتی بنیاد کے طور پر تسلیم نہیں کیا، جو 11 اگست کو جناح صاحب نے ملک کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے فلور پر اپنی پہلی تقریر میں پیش کیا تھا۔ آج تک قراردادِ مقاصد ملکی آئین کی بنیاد ہے، جسے تبدیل کرنے کی جرئت پارلیمنٹ میں موجود قوتوں میں سے بھی کسی میں بھی نظر نہیں آتی۔ یہ قرارداد 11 اگست کی جناح صاحب کی سیکولر تقریر کے روح کی سراسر نفی اور پاکستان کو رجعت پسندی کی سمت لے جانے کی باقائدہ منظم اور ایک کامیاب کوشش تھی۔ اب اس ملک میں کوئی نام نہاد بڑی سیاسی جماعت یہ کہنے کی جسارت اور جرئت نہیں کرتی کہ ملکی آئین کا ابتدائی بیانیہ قراردادِ مقاصد کی جگہ جناح صاحب کی یہ مذکورہ سیکولر تقریر ہونی چاہیے۔

(5) پاکستان کا قیام بطور ایک وفاقی مملکت کے ہوا تھا جو کہ ظاہر ہے کہ اس کی آئینی اکائیوں کی بنیادوں پر مبنی تھا لیکن 1955ع میں مغربی پاکستان کی قومیتی اور آئینی اکائیوں کا وجود ختم کر کے ون یونٹ قائم کیا گیا، جو کہ درحقیقت وفاق کے سماجی معاہدے کو ختم کرنے کے مترادف تھا، کیوں کہ وفاقیت کی اولین شرط خود مختار اور رضاکارانہ اکائیاں ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ون یونٹ کا ڈیڑھ دہائی کا عرصہ ملکی وفاق کے لیے تاریک ہی نہیں بلکہ اس کے لیے شدید ضرب ثابت ہوا، جس کی وجہ سے ملک آج تک سنبھل نہیں پایا۔ کیوں کہ آئینی طور پر تو 1970ع میں ون یونٹ ختم ہو گیا لیکن وہ ذہنیت ختم نہیں ہو سکی اور ریاست پر عملی طور پر قابض قوتوں کے ذہنوں میں وہ آج بھی موجود اور زیرِ عمل ہے۔

(6) 1956ع میں ملکی تاریخ کا پہلا آئین ملک کے قیام کے 9 سال کے بعد تشکیل دیا گیا۔ ون یونٹ کے ہوتے ہوئے جو آئین دیا گیا اسے وفاقیت کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا، کیوں کہ وفاق

کی چار مشمولہ اکائیاں مغربی پاکستان میں موجود ہی نہیں تھیں اور ون یونٹ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مشرقی بنگال کی اکثریتی جمہوری حیثیت سے انکار کیا جائے۔ دوسری بات کہ 1956ع کے آئین میں سینیٹ کا ایوان تشکیل ہی نہیں دیا گیا تھا اور دنیا میں کوئی بھی وفاقی ملک صوبوں کی مساوات کی بنیاد پر نمائندہ ایوان یعنی سینیٹ کے بغیر ہوتا ہی نہیں۔ تیسری عجیب بات یہ ہے کہ وہ ملکی تاریخ کا واحد آئین تھا جس میں صوبوں کو نسبتاً زیادہ خود مختاری حاصل تھی مگر چونکہ مغربی پاکستان میں آئینی اکائیوں کا وجود ہی ختم کر دیا گیا تھا تو پھر اس صورت میں صوبائی خود مختاری کا مطلب عملی طور پر پنجاب کی مکمل بالادستی کو یقینی بنانا تھا۔ بہر حال وہ آئین بھی دو برس تک بھی برقرار نہیں رہ سکا اور ایوب خان نے 1958ع میں اسے معطل کر دیا۔ پاکستان کی تاریخ میں ایوب خان کا آمرانہ دؤرِ حکومت دیگر تمام آمریتوں سے طویل تھا اور اس دوران ملک میں وفاقیت اور جمہوری اقدار کو بُری طرح مسخ کیا گیا، جس کے نقشِ قدم پر چل کر بعد میں آنے والے آمروں یعنی یحیٰ خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف نے ملک میں آئینی اندازِ حکومت، جمہوریت کے اُصولوں اور وفاقی نظام کے تقاضوں کا شیرازہ بکھیر دیا۔

(7) 1962ع کا آئین وفاقی پاکستان یا اس کی مشمولہ اکائیوں کے لیے نہیں بلکہ ایوب خان کی ذات کے لیے تھا، اس لیے اسے وفاقی یا ملکی آئین نہیں کہا جا سکتا۔ اس آئین میں پارلیمانی نظام کو ختم کر کے تمام اختیارات ایوب خان کو دیے گئے، جس نے ملک میں ''بنیادی جمہوریت'' کا ڈرامہ کر کے وفاقیت اور اس کی وحدتوں کی خود مختار حیثیت کی نفی کی۔ پاکستان میں قومیتی تضادات، بین الصوبائی تنازعات، ملک میں آبادی کی متنوع حیثیت اور دیگر عوامل کی وجہ سے صدارتی نہیں بلکہ وفاقی پارلیمانی نظام ہی موزون ہو سکتا ہے۔ اس لیے 1962ع کے دستور نے بھی ون یونٹ کے ساتھ ساتھ ملک میں وفاقی نظام کے بنیادی اُصولوں کی نہ صرف نفی کی بلکہ وفاقی کلچر کی روح کو بھی مجروح کیا۔ اگر ابراہام لنکن کی وصف کو پاکستانی تناظر میں تبدیل کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ 1962ع کا دستور ایوب خان کا دستور، ایوب خان کی جانب سے اور ایوب خان کے لیے تھا، جس میں ملک کی پارلیمنٹ یا مشمولہ اکائیوں اور عوام کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ 1962ع کے دستور نے ملک میں جمہوریت، دستور اور وفاقیت کو ایک آمر اور

فردِ واحد کی مطلق العنان حکمرانی کے طابع کر دیا، جس کی پیروی بعد میں متواتر آنے والے آمروں نے کی۔ 1973ع کے دستور میں ضیاءالحق کی 8ویں اور پرویز مشرف کی 17ویں ترامیم اس کا ثبوت ہیں۔

(8) 1970ع کی آئین ساز اسمبلی کے انتخابات نسبتاً ملکی تاریخ کے واحد شفاف اور بنیادی انتخابات تھے، جس کے نتائج وفاقیت کے ڈانواڈول ڈھانچے کو بہتر بنانے کے لیے ایک بہترین موقع ہو سکتا تھا لیکن اس کے برعکس انتخابات کے نتائج میں واضح اکثریت حاصل کرنے والی عوامی لیگ کے مینڈیٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا اور بالآخر ملک دولخط ہو گیا اور دو قومی نظریے کا مفروضہ بھی عملی طور پر اپنے انجام کو جا پہنچا اور ثابت ہوا کہ وفاقی ممالک مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ تنوع کے احترام، عدم مرکزیت، صوبائی خود مختاری اور مالیاتی انصاف کے اُصولوں پر استوار ہوتے ہیں۔

(9) مشرقی بنگال کی علحدگی کے بعد جو نصف سے بھی کم اسمبلی رہ گئی اس کی بنیاد پر جو 1973ع کا جو آئین تشکیل دیا گیا وہ اُصولی طور پر ناجائز تھا، کیوں کہ جس آئین ساز اسمبلی کے لیے 1970ع میں انتخابات منعقد ہوئے تھے اس کے نتائج ہی قبول نہیں کئے گئے، اس لیے اُصولی طور پر مشرقی بنگال کی آزادی کے بعد ایک نئی آئین ساز اسمبلی کے انتخابات ہونے چاہیے تھے لیکن اس کے برعکس باقی رہ جانے والی اسمبلی سے ایک آئین تشکیل دیا گیا، جس کا اس کو مینڈیٹ حاصل نہیں تھا۔ اُصولی طور پر مشرقی بنگال کی علحدگی کے بعد ملک میں دوبارہ آئین ساز اسمبلی کے نئے انتخابات ہونے چاہیے تھے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کے نتائج یقینی طور پر مختلف آتے، کیونکہ مشرقی بنگال کی علحدگی کے سانحے نے مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں اور مظلوم قومیتوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بہر حال اس آئین کی عمر بھی چار سال سے زیادہ نہیں ہوئی، گو کہ وہ آئین بھی 1935ع کے برطانوی آئین کی طرز پر مرکزیت پر مبنی تھا، جس میں پاکستان کی کثیر القومی، کثیر السانی اور کثیر المذہبی حیثیت سے انکار کیا گیا تھا۔

(10) مشرقی بنگال کی علحدگی کے نتیجے میں عوامی لیگ کے الگ ہونے اور نعپ پر پابندی نے پاکستان میں وفاقی سیاست کی بنیادیں ہلا دیں اور پھر پاکستان پیپلز پارٹی نے بھی ملک کی

اسٹبلشمنٹ اور دائیں بازو کے حامل گروہوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو کو یہ ہزار مرتبہ سوچنا چاہیے تھا کہ عوامی لیگ کی جدائی اور نعپ کی بندش سے اس ملک میں حقیقی وفاقی سیاست اور سیاسی طور پر طاقت کا توازن بگڑ جائے گا اور پھر اسٹبلشمنٹ اور دائیں بازو والوں کی قوت کا سامنا کرنا ان کے لیے اکیلے طور پر ناممکن ہو جائے گا لیکن تاریخ کا المیہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکا۔ اس کے نتائج بعد میں ملک نے، چھوٹے صوبوں اور مظلوم قومیتوں نے اور خود ذوالفقار علی بھٹو کی ذات نے بدترین انداز میں بھگتے۔ عوامی لیگ پاکستان پیپلز پارٹی کی حریف جماعت ضرور تھی لیکن اس کا وجود نظریاتی، سیاسی اور فکری اعتبار سے اور سیاسی توازن کے لحاظ سے اس ملک کی اشد ضرورت تھا، اور اس لیے بھی کہ وہ جماعت ملک کی مظلوم قومیتوں اور طبقات کی ایک نمائندہ جماعت تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو چونکہ نظریاتی طور پر دائیں اور بائیں بازو کے درمیان مرکز کے حامل تھے اس لیے بھی ان کی ضرورت تھی کہ ملک میں عوامی لیگ کی صورت میں ریاست اور دائیں بازو کے سامنے ایک متبادل نقطہء نظر اور طاقت کا توازن ہوتا، لیکن افسوس کہ بھٹو صاحب اس دوراندیشی سے قاصر رہے۔ یہ درست ہے کہ قیادت کی غلطیاں عوام اور قوموں کو دہائیوں اور صدیوں تک بھگتنی پڑتی ہیں۔

(11) جنرل ایوب، یحیٰ، ضیاء اور پرویز مشرف کی آمریتوں نے جمہوریت اور عوام پر جو ظلم و ستم ڈھائے ان تباہکاریوں کے علاوہ درحقیقت انہوں نے سب سے بڑا نقصان ملک کے وفاق کو پہنچایا، کیوں کہ آمریتوں میں چھوٹی یا طاقت کے توازن میں کمزور حیثیت کی حامل اکائیوں کی خودمختار حیثیت کی مکمل طور پر نفی کی گئی اور آج اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ دنیا بھر میں آئینی راج وفاقیت کے نظام کا لازمی جز تصور کیا جاتا ہے، جس میں وفاق کی وحدتوں پر اور کسی بھی قوت کو اپنے اختیارات استعمال کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ ملک میں متواتر آمریتوں نے پاکستان میں قومیتوں، صوبوں، حکومتوں اور عوام کے درمیان سماجی عمرانی معاہدے کو عملی طور پر ختم کر دیا۔

(12) جس ملک میں 2008ع سے قبل ملکی تاریخ کی کوئی بھی سیاسی حکومت اپنی میعاد پوری نہیں کر سکی اس کے وفاقیت کے نظام کے استحکام اور شفافیت کا اندازہ باآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ 2008ع کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکزی حکومت نے گرتے سنبھلتے ہوئے اپنی آئینی

معیاد تو مکمل کر لی لیکن اس پر عدم سلامتی کی تلوار مسلسل لٹکتی رہی اور 2013ع کے بعد ملک میں آنے والی مسلم لیگ (ن) کی حکومت بھی مسلسل عدم تحفظ کے احساس اور بحران سے دوچار رہی ہے۔ اس وقت ملک میں غیر اعلانیہ طور پر تمام بنیادی اختیارات رسمی طور پر بھی اسٹبلشمنٹ کے پاس ہیں۔ ایسی صورتحال میں صوبائی یا مرکزی حکومتیں اپنے آئینی اختیار کس طرح اور کس حد تک استعمال کر سکتی ہیں، اس کی مثال ملک کا موجودہ پیش منظر ہے۔

(13) وفاقیت صرف سیاسی خصوصیات یا عوامل کی حامل نہیں ہوتی بلکہ اس کا ایک اہم پہلو مالیاتی بھی ہوتا ہے۔ پاکستان میں وفاقیت کا مالیاتی پہلو بھی اتنا ہی المناک رہا ہے جتنا سیاسی اور ثقافتی وفاقیت کا۔ 1971ع سے قبل جب مشرقی بنگال پاکستان کا حصہ تھا اور وہ آبادی کے لحاظ سے 57 فیصد حصہ تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ مالیاتی ایوارڈ میں آبادی کو بھی شامل کیا جائے، تب کسی بھی ایوارڈ میں آبادی کو شامل نہیں کیا گیا، کیوں کہ ایراضی میں مغربی پاکستان بڑا تھا اور روینیو میں آمدنی بھی مغربی پاکستان کی زیادہ تھی (سندھ میں سمندری بندرگاہ کی وجہ سے)، اس لیے مالیاتی ایوارڈ کی بنیاد صرف ایراضی اور روینیو کو بنایا گیا تھا۔ 1971ع کے بعد 1974ع میں جیسے ہی بھٹو صاحب کے دؤر میں ملک کا پہلا مالیاتی ایوارڈ آیا تو اس میں صرف آبادی کو بنیاد بنایا گیا، کیوں کہ نئی صورتحال میں پنجاب کی آبادی 56 فیصد تھی اور اگر ایراضی اور روینیو کو شامل کیا جاتا تو بلوچستان اور سندھ کو فائدہ ہوتا۔ 1996ع میں ملک معراج خالد کی عبوری حکومت نے آبادی کے اعتبار سے چھوٹے صوبوں یعنی سندھ، بلوچستان اور پختون خواہ کو گہری ضرب لگاتے ہوئے راتوارات بغیر کسی آئینی لوازمات پورے کیے وفاق کا حصہ 20 فیصد سے بڑھا کر 67 فیصد کر دیا اور صوبوں کا مالیاتی ایوارڈ میں حصہ 80 فیصد سے کم ہو کر 33 فیصد رہ گیا۔ اب جا کر 18 ویں آئین ترمیم اور ساتویں مالیاتی ایوارڈ میں صوبوں کا حصہ 56 فیصد طے کیا گیا ہے اور اسے آئینی تحفظ بھی دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود ملکی روینیو میں 72 فیصد حصہ دینے والے سندھ کو بدلے میں 24.3 فیصد دیا جاتا ہے اور اس میں سے بھی وفاق کی کٹوتیوں کی کہانیاں الگ ہیں۔ گو کہ اب ایراضی، غربت اور روینیو کو مالیاتی ایوارڈ کی تقسیم میں جزوی طور پر شامل تو کیا گیا ہے لیکن آج بھی آبادی کا حصہ 80 فیصد سے زیادہ ہے۔

(14) میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ ثقافتی، مذہبی اور قومیتی تنوع وفاقیت کی بنیاد اور ان کو تسلیم کرنا اور تحفظ فراہم کرنا وفاقیت کا بنیادی اُصول اور فرض ہوتا ہے لیکن پاکستان میں آج تک ایک ہی زبان کی لسانیاتی اجارہ داری اور ایک مخصوص ثقافتی اقلیت کی گنگا جمنی ثقافت کی وحدانیت ملک پر زبردستی تھوپی گئی ہے۔ پارلیمنٹ کی سیاسی بلوغت اور وفاقیت کے نظام سے شناسائی کا حال یہ ہے کہ جب حال ہی میں زبانوں کے بارے میں بل سینٹ کی اسٹینڈنگ کمیٹی میں پیش ہوا تو اسے پہلے یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ اس سے وفاق کو خطرہ لاحق ہوگا۔ جب کہ وفاق کو حقیقی خطرہ ثقافتی، لسانی تنوع اور قومیتی تکثریت کے انکار اور مرکزیت پسندی سے ہوتا ہے۔

(15) تمام آئینی، انتظامی، ثقافتی اور مالیاتی معاملات کے ساتھ ساتھ وفاقیت کے نظام کے لیے حقیقی وفاقیت کی حامل سیاست بھی درکار ہوتی ہے، جو کہ قوموں کے وجود، تاریخی زبانوں کی قومی حیثیت، آئینی اکائیوں کی مکمل خود مختاری اور عدم مرکزیت پر مبنی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں وفاقی سیاست کا مطلب اس کے برعکس سمجھا جاتا ہے۔ یہاں پر ملکی سطح پر وفاقی سیاسی جماعتوں کی نظر میں وفاقیت کا وہ ہی تصور عام اور رائج ہے جو کہ ملک کی اسٹبلشمنٹ یا حقیقی طور پر ریاست پر قابض حکمران طبقے کا ہے۔ اس لیے درحقیقت حکومت کوئی بھی ہو اور کسی کی بھی ہو لیکن ملک کا بنیادی بحران ریاست کا تضاد اور وفاقیت اور جمہوریت کے بنیادی اُصولوں کی انحرافی ہے۔ 70 برس سے اس تباہ حالی کی ذمہ داری اپنے سر پر آخر کوئی کیوں نہیں لیتا؟ پاکستان کی بحران زدہ وفاقی ریاست کا ہمہ گیر ریاستی بحران اتنا لاوارث کیوں ہے؟ جب کہ یہ بحران ناجائز مفادات کے حامل گروہ اور حکمران طبقے کا پیدا کردہ ہے جس کے پاس گذشتہ ستر سال سے ملک کی حقیقی باگ ڈور رہی ہے۔ اس ملک کے وفاقی بحران کے حقیقی ذمہ دار وہ ہی ہیں۔

مندرجہ بالا بحث مباحثے اور حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان نے اگرچہ وفاقیت کا نظام برطانوی نوآبادیات سے ورثے میں لیا تھا لیکن اس کے باوجود اگر اس ملک کے چلنے اور کامیاب ہونے کی کوئی صورت ہو سکتی تھی تو وہ وفاقیت کا جمہوری نظام ہی تھا، جو کہ تنوع کے احترام اور تحفظ، عدم مرکزیت، مکمل صوبائی خود مختاری اور ایک عوامی فلاحی اور سیکولر ریاست کی صورت میں ہی ممکن تھا۔ وفاقیت کا نظام اس میں مرکزی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ

الگ بات ہے کہ اس کے لیے مشمولہ اکائیوں، قومیتوں، تمام لسانی گروہوں اور مجموعی طور پر عوام میں جباست اور رضامندی کے جذبات انصاف اور برابری کے تقاضوں کی بنیاد پر پیدا کیے جاتے۔ مہرالنساء علی نے درست لکھا ہے کہ ''وہ عنصر جو ایک وفاقی مملکت کے قیام کے لیے ضروری ہے وہ ثقافتی اعتبار سے اپنا تشخص کھوئے بغیر مختلف النوع گروہوں کے اتحاد کی خواہش ہے''۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ وفاقیت کے لیے صرف وفاقی ریاست یا وفاقی دستور ہی نہیں بلکہ ایک متنوع وفاقی معاشرہ بھی درکار ہوتا ہے۔

پاکستان میں جمہوری وفاقیت کا بحران

پاکستان کا ریاستی بحران اب کوئی راز نہیں رہا۔ پاکستان کو دنیا میں عموماً ایک ناکام، متنازعہ اور پیچیدہ ریاست کے حوالے سے دیکھا اور جانا جاتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد آبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد پاکستان کے ساتھ یا اُس دَور میں جتنی بھی ریاستیں معرضِ وجود آئیں یا آزاد ہوئیں، ان کی اکثریت آج ترقی اور امن کے راستے پر گامزن ہے، لیکن پاکستان کا ریاستی بحران ستر سال گذرنے کے باوجود بنیادی مسائل کی دلدل سے نکل نہیں سکا۔ دنیا میں پاکستان کی حیثیت ایک خود مختار ریاست کی نہیں۔ گذشتہ ستر سال پاکستان نے امریکہ کے سامراجی مفادات کی بجاآوری میں گذارے اور اب چین کی باری ہے۔ داخلی طور پر ملک میں ریاست کا کوئی مثبت، عوام دوست اور فعال وجود نظر نہیں آتا۔ کیونکہ ابھی تک ملک کو ایک حقیقی وفاقی جمہوریہ اور فلاحی ریاست بنانے کی جانب کوئی سنجیدہ پیش رفت نظر نہیں آتی۔ جس ملک کو ایک سیکورٹی ریاست کے طور پر چلایا جارہا ہے وہاں سات دہائیاں ملک کے وسائل "دفاع" کے نام پر "خرچ" کرنے کے باوجود اپنے ہی پیدا کیئے ہوئے پانچ دس ہزار دہشتگردوں کا مکمل خاتمہ نہیں ہو پارہا (یا ریاست اس کا حقیقی خاتمہ کرنا ہی نہیں چاہتی)۔ ملک میں امن وامان کے بحران اور لاقانونیت کی بھی کوئی حد نہیں رہی۔ غربت اور بے روزگاری نے عوام سے جینے کا حق چھین لیا ہے۔ توانائی کے بحران اور بدانتظامی سے ملک کا کاروبار گھٹنے ٹیک چکا ہے۔ صوبوں

اوران میں بسنے والی قومیتوں کی خود مختاری، منصفانہ مالیاتی تقسیم، پانی کا تنازعہ، قومیتوں کا حقیقی معنوں میں اپنے قدرتی وسائل پر مکمل اختیار، حقیقی پارلیمانی جمہوری اندازِ حکمرانی، پارلیامینٹ کی بالادستی اور نئے سماجی معاہدے کے معاملات وہیں کے وہیں اُلجھے ہوئے ہیں۔

یہ صورتحال جس سنگین ریاستی بحران کا ہمہ گیر عکس پیش کرتی ہے، اس کا تو کوئی منصفانہ اور متوازن حل نکلتا ہوا نظر نہیں آتا اور نہ ہی حکومتی و ریاستی سطح پر اس کے لئے مطلوبہ سنجیدگی نظر آتی ہے۔ اس لئے اب یہ تاثر تیزی کے ساتھ ملک میں جڑیں پکڑ رہا ہے کہ یہ ملک مافیائوں اور ناجائز مفادات کا مسکن اور ایک لاعلاج مریض بنتا جارہا ہے، اور اب اس ملک سے کسی بہتر تبدیلی اور انصاف کی توقع کرنا محض ایک خود فریبی ہوگی۔ نئی نسل تو ایک طرف لیکن جس نسل نے یہ ملک بنایا تھا، اب وہ بھی مکمل طور پر پاکستان کے بہتر، جمہوری، قومی برابری پر مبنی اور اس کے سیکیولر مستقبل سے مایوس نظر آتی ہے۔

اس کے باوجود ملک کے تمام روشن خیال اور دوراندیش لوگ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ اگر ان تمام مایوسیوں اور پیچیدگیوں کے باوجود ملک کے باقی رہنے اور چلنے کی کوئی صورت ممکن ہو سکتی ہے تو وہ نظام کی تبدیلی، حقیقی جمہوریت اور محض برائے نام اور رسمی صوبائی خود مختاری نہیں بلکہ چاروں صوبوں میں بسنے والی تاریخی قومیتوں کی مکمل قومی خود مختاری اور ان کے درمیان ایک نیا عمرانی اور سیاسی معاہدہ ہی ہو سکتا ہے، جس کی بنیاد وفاقیت اور عوامی جمہوریت کے عالمی طور پر تسلیم شدہ اُصولوں اور [1] 1940ء کی قراردادِ لاہور کی روح پر مبنی ہو۔ 1940ء کی قرارداد میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ:

> "It is considered view of this session of the All-India Muslim League that no constitutional plan would be workable in this country or acceptable to the Muslims unless, it is designed on the following basic principles, viz, that geographically contiguous units are demarcated into regions which should be

---

[1] Dr. Riaz Ahmed,"All India Muslim League and the creation of Pakistan",(A Chronology), p. 95

so constituted, with such territorial readjustments as may be necessary, that the areas in which Muslims are in majority as in North-western and eastern zones of India, should be so grouped to constitute 'Independent states' in which the constituent units shall be autonomous and sovereign."[(2)]

"..... وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، جیسا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی حصوں میں ہے، یکجا ہو کر "آزاد ریاستیں" بن جائیں، جن کی ترکیبی اکائیاں بااختیار اور خود مختار ہوں۔"

اب آیئے پاکستان کے مجموعی ریاستی بحران کے تناظر میں قومی تضاد اور قومی/ صوبائی خود مختاری کے سوال پر ایک نظر ڈالیں۔

برِصغیر کی تقسیم اور صوبائی خود مختاری:

برِصغیر کی تقسیم کے حوالے سے ریاستی سطح پر بہت غلط مفروضات، جواز اور دلائل پیش کیئے جاتے ہیں، جن کا لبِ لباب یہ ہے کہ پاکستان محض اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا تھا، جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ خود پاکستان کی تخلیق کی دعویدار جماعت مسلم لیگ جب 1906ء میں ڈھاکا میں معرضِ وجود میں آئی تھی تو وہ اپنی سوچ اور نظریات میں فرقہ پرست اور انگریز پرست تو یقیناً تھی لیکن علیحدگی پسند ہرگز نہ تھی۔ مسلم لیگ مشترکہ ہندوستان میں محدود وفاق اور مسلمان اکثریتی علاقوں اور بعد میں صوبوں کے لئے زیادہ سے زیادہ صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کر رہی تھی۔ انگریزوں یا خود انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ 1906ء سے لے کر 1947ء تک مسلم لیگ کے جتنے بھی مذاکرات یا اجلاس ہوئے اور جن مطالبات یا تنازعات پر بات چیت ہوئی، ان میں اسلام کا کوئی بھی ذکر نہیں تھا۔ اصل مسئلہ اسلام کا نہیں بلکہ مشترکہ ہندوستان میں محدود اختیارات کے حامل ایک جمہوری وفاق اور مسلمان اکثریتی علاقوں/ صوبوں کی مکمل خود مختاری کا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے

---

(2) محمد ابراھیم جویو، "سندھ منھنجے خواہن جی"، 2008ء، سینٹر فار پیس اینڈ سول سوسائٹی حیدر آباد، صفحہ: 197.

اختلافات اسلام یا ہندومت پر نہیں بلکہ شمال-مشرق اور شمال-مغرب مسلمان اکثریتی صوبوں/ علاقوں کی خود مختاری پر مبنی تھے۔1916ء کے لکھنؤ پیکٹ میں بھی مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیاں مذہبی نہیں بلکہ سیاسی معاملات کا وقتی سمجھوتہ اور تصفیہ ہوا، جو کہ بد قسمتی سے دیرپا ثابت نہ ہوسکا۔1928ء میں مسلم لیگ نے جس بنیاد پر کانگریس کی مشہور زمانہ "نہرو رپورٹ" (جو کہ اصل میں کانگریس کا ہندوستان کے لیے ایک تجویز کردہ دستور اور پالیسی مسودہ تھا) کو رد کیا، اس کے بنیادی اسباب اور محرکات بھی صوبائی خود مختاری پر مبنی تھے، کیونکہ نہرو رپورٹ میں ایک سخت مرکزیت پسند وحدانی طرزِ حکومت پر زور دیا گیا تھا۔ دوسرے معاملات تو ایک طرف، خود[3] 29 دسمبر 1930ء میں اِلہ آباد میں مسلم لیگ کے وقتی صدر (اردو اور فارسی کے عظیم شاعر) علامہ محمد اقبال نے پہلی مرتبہ جب آل انڈیا مسلم لیگ کے اکیسویں اجلاس میں سندھ، پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے علاقوں کو ملا کر، ہندوستان میں شمال-مغرب اور شمال- مشرق مسلم اکثریتی ریاست (جو چاہے برطانوی شہنشاہیت کے اندر ہو یا باہر) کی تشکیل کا تصور دیا تھا، تو وہ بھی اسلام کے نام پر نہیں تھا، یہاں تک کہ وہ مسلم لیگ میں بھی متنازعہ بنا تھا اور چھوٹے صوبوں اور قومیتوں کے لوگوں نے اس تصور کو اُس زمانے میں بھی گریٹر پنجاب کے تصور سے تعبیر کیا تھا۔ 1927ء میں انگریز سرکار کی جانب سے بنائی ہوئی یک طرفہ اور متنازعہ "سائمن کمیشن" کی ناکامی اور 1928ء میں کانگریس کی "نہرو رپورٹ" کی متنازعہ حیثیت سامنے آنے کے بعد 1929ء میں برطانوی حکومت کی جانب سے کروائی گئی "گول میز کانفرنس" کی ناکامی کا سبب بھی کوئی مذہبی مسئلہ نہ تھا بلکہ محدود مرکز اور صوبائی خود مختاری کے حوالے سے آئینی ضمانتوں کے فارمولا پر کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان عدم اتفاق تھا۔1935ء میں انگریزوں نے "گورنمینٹ آف انڈیا ایکٹ" دیا تو وہ بھی مسلمانوں نے دل سے قبول نہیں کیا، کیونکہ اس میں بھی ایک مضبوط اور اختیارات کی مرکزیت کے حامل وفاق کا تصور دیا گیا تھا، جب کہ اس

---

[3] Dr. Riaz Ahmed "All India Muslim League and the Creation of Pakistan. (A Chronology) p.38-39

میں صوبوں کو بہت محدود خود مختاری دی گئی تھی۔ یعنی 1935ء کے انڈین ایکٹ کی متضاد اور متنازعہ حیثیت کا بنیادی سبب بھی مذہبی نہیں بلکہ آئینی اور سیاسی تھا، جس میں مسلم لیگ کا بنیادی اعتراض محدود صوبائی خود مختاری کے حوالے سے تھا۔ جب کہ 1935ء کے انڈین ایکٹ میں مسلم لیگ کے جداگانہ طریقہ انتخاب (Seperate Electorates) کے فرقہ پرست مطالبے اور سندھ کے ساتھ کچھ صوبوں کے قیام کو تسلیم بھی کیا گیا تھا لیکن محدود صوبائی خود مختاری کی وجہ سے وہ مسلم لیگ کے لیے متنازعہ بنا۔ جب کہ کانگریس کا اعتراض یہ تھا کہ مسلم لیگ کے جداگانہ طریقہ انتخاب کے فرقہ پرست مطالبے کو آئینی طور پر کیوں تسلیم کیا گیا ہے۔

مذہب کا ناجائز استعمال:

حقیقت یہ ہے کہ جہاں ایک طرف انگریز اور کانگریس کی پالیسیاں اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کیلئے انتہائی متنازعہ تھیں، وہاں خود مسلمانوں میں بھی صوبائی خود مختاری کو چھوڑ کر باقی بہت سے معاملات پر ان کے درمیان کوئی باہمی اتفاق نہیں تھا اور نہ ہی کسی جداگانہ مسلمان ریاست کے قیام کا کوئی واضح مطالبہ یا اس کے لئے کوئی وسیع تر اتفاق موجود تھا۔ گرچہ 1938ء کے کراچی کے اجلاس میں مسلم لیگ پاکستان کیلئے واضح مطالبہ کر چکی تھی لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ 1940ء میں جب مسلم لیگ نے لاہور کے اجلاس میں ایک تاریخی قرارداد کو پاس کیا، جس میں وفاقی اکائیوں کے لئے خود مختار اور آزاد مملکتوں کی حیثیت کی بات کی گئی تھی، تب ہی سندھ اور مسلمان اکثریتی علاقوں میں سے کچھ صوبوں نے آگے بڑھ کر پاکستان میں شمولیت کی حمایت کی۔ کیونکہ اس میں صرف صوبائی خود مختاری نہیں بلکہ وفاقی قومی وحدتوں کو واضح طور پر آزاد اور خود مختار مملکتوں سے تعبیر کیا گیا تھا۔ اوپر دیئے ہوئے دلائل کے حق میں اس کے علاوہ مزید اور کون سا دلیل ہو سکتا ہے کہ 1946ء میں جب "کیبنٹ مشن" پلان میں مکمل صوبائی خود مختاری کی بات کی گئی تو مسلم لیگ پاکستان کے مطالبہ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ وہ الگ بات ہے کہ جواہر لال نہرو نے اپنی کوتاہ نظری کا مظاہرہ کر کے ایک پریس کانفرنس کر کے اس نازک صورتحال کی کایا پلٹ دی اور بلآخر بدقسمتی سے برِصغیر کی

تقسیم وقوع پذیر ہوئی۔ چناچہ کہا جاسکتا ہے کہ تقسیم سے پہلے بھی متحدہ ہندوستان میں اصل اور بنیادی مسئلہ، بحران یا تضاد صرف مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھا۔ جس میں اختیارات کی مرکزیت کا حامل وفاق مذہبی اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کو قبول نہیں تھا۔ یعنی کانگریس "ایک قومی نظریئے" (One Nation Theory) کے جھوٹے مفروضے اور اختیارات کی مرکزیت کی حامل وفاقی سوچ اور پالیسی سے بالاتر ہو کر صوبوں کو خود مختاری کی ضمانت دیتی تو مسلم لیگ "دو قومی نظریئے" (Two Nation Theory) کا فتنہ پیدا کر کے، اپنی فرقیوارانہ سوچ اور نظریئے کے باوجود ہندوستان کی تقسیم کے لئے مسلمانوں کی حمایت حاصل نہ کر سکتی اور ہندوستان شاید یوں تقسیم نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے موجود تضاد بنیادی طور پر مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھا، جس کا اصل محرک خود مختاری کا سوال تھا، لیکن انگریزوں، کانگریس اور مسلم لیگ تینوں فریقوں نے اپنے اپنے گروہی اور ناجائز مفادات کے لیے مذہب کا ناجائز استعمال کیا۔ انگریزوں کی خواہش تھی کہ مسلمانوں اور ہندؤں میں مذہبی اور پس وپیش سیاسی تضاد پروان چڑھے، تاکہ وہ مشترکہ نظریاتی، معاشرتی اور سیاسی کردار ادا نہ کر سکیں۔ 1905ء میں انگریزوں نے بنگال کو تقسیم کر کے عملاً اس کی بنیاد رکھی۔ کانگریس بظاہر تو سیکیولر ہونے کی دعویدار تھی لیکن وہ خاص طور پر گاندھی اور موتی لعل نہرو کے بعد عملی طور پر متعصب کردار کے ساتھ سامنے آئی اور ایک کثیر مذہبی سیکیولر پارٹی کی بجائے عملی طور پر ہندو بورجوا طبقے کی نمائندہ پارٹی میں تبدیل ہو گئی۔ مسلم لیگ کے جاگیر دارانہ کردار اور اس کی فرقہ پرست سوچ اپنی جگہ پر لیکن کانگریس نے اس کے جائز سیاسی مطالبات کو بھی نظرانداز کرتے ہوئے ان کو مذہبی رنگ دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مثلاً کانگریس بمبئی پریزیڈنسی سے سندھ کی علیحدگی کی شدید مخالفت کر رہی تھی اور اس طرح ہندوستان کو کثیر قومی اور کثیر ثقافتی ملک تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھی اور آخر دم تک مرکزیت پسند اور مضبوط وفاق کی حمایت اور صوبائی خود مختاری کی مخالفت کرتی رہی۔ جس سے دوسری مذہبی اقلیتوں اور خاص طور پر مسلمان اکثریتی علاقوں کے عوام میں سیاسی طور پر عدم سلامتی کا احساس پیدا ہوا۔ یعنی کانگریس کے سیکیولرزم کا عملی مطلب رام راج کا احیاء اور قیام تھا۔ اسی طرح مسلم لیگ

نے محدود مرکز اور زیادہ سے زیادہ صوبائی خود مختاری پر مبنی اپنے جائز نقطہ ءِ نظر کو سیکیولر اور مہذب سیاسی انداز میں پیش کرنے کی بجائے "دو قومی نظریئے" جیسی فتنے باز اور فرقہ پرست صورت میں پیش کیا، جس نے مسلمانوں کے حکمران طبقات کو تو فائدہ پہنچایا لیکن عوام کو ایک ایسے فرقہ پرست تضاد کی دلدل میں دھکیل دیا، جہاں سے نکلنے کے لئے وہ آج تک ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

مسلم لیگ کی منافقت اور پاکستان کی بنیاد:

تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ جس مسلم لیگ نے متحدہ ہندوستان میں مضبوط مرکز کے خلاف مسلسل جدوجہد کی اور کانگریس کی "نہرو رپورٹ" یا 1935ء کے انڈین ایکٹ کو مضبوط مرکز کی بنیاد پر رد کیا، اس نے پاکستان کے قیام کے بعد ایک طرف تو صوبائی خود مختاری کے تصور کی ہی نفی کرنا شروع کی اور اختیارات کی مرکزیت کے حامل اور متنازعہ 1935ء کے انڈین ایکٹ کو پاکستان کے عبوری دستور کے طور پر قبول کیا۔ 1940ء کی قراردادِ لاہور کے تحت وفاقِ پاکستان میں شامل ہونے والی اکائیوں کو آزاد اور خود مختار ریاستوں کا درجہ دینے کی بات کی لیکن مسلم لیگ نے پاکستان بننے کے بعد اپنے وعدوں اور جدوجہد کے ساتھ بدترین انحرافی اور مثالی غداری کی۔ یعنی جس ایکٹ کے خلاف اس نے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا، بعد میں اسی ایکٹ کو ہی پاکستان کے عبوری دستور کا درجہ دیا اور 1940ء کی قراردادِ لاہور، جس کو بعد میں "قراردادِ پاکستان" کا نام دیا گیا، کو عملی طور پر تاریخ کے کباڑ خانے میں پھینک دیا۔ تاریخ کا المیہ یہ بھی ہے کہ ملک کے بانی محمد علی جناح جو کہ متحدہ ہندوستان میں مذہبی اقلیتوں کے سیاسی حقوق اور صوبائی خود مختاری کے سب سے بڑے وکیل اور علمبردار تھے اور جنہوں نے ہمیشہ اختیارات کی مرکزیت کے حامل وفاق کو رد کیا، انہوں نے بھی 1947ء سے لیکر تادم مرگ پاکستان کی بنیاد 1940ء کی قرارداد کے تحت استوار کرنے کے لئے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ ملک کے گورنر جنرل کے طور پر ان کو اختیارات حاصل تھے کہ وہ 1935ء کے مرکزیت پسند اور سامراجی عبوری دستور کو ترامیم کے ساتھ تبدیل کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے ایسی کوئی بھی کوشش نہیں کی، بلکہ اس کے برعکس پورا سال پُرجوش تقاریر کرتے رہے کہ ملک کی قومی

زبان صرف اردو ہو گی اور ملک میں صوبائیت کی کوئی بھی گنجائش نہیں ہو گی۔ یعنی پاکستان کی خالق تاریخی اقوام کو آزاد اور خود مختار ریاستوں کا درجہ دینے کا واعدہ کرنے والے جناح صاحب اب محض صوبائی خود مختاری تو کُجا صوبائیت کو ہی عصبیت کہتے رہے۔ مثلاً 15 جون 1948ء کو کوئٹہ میونسپالٹی کی جانب سے دیئے گئے استقبالیہ میں انہوں نے واضح طور پر کہا کہ :

"برطانوی کنٹرول سے محفوظ رہنے کیلئے صوبائی خود مختاری اور مقامی آزادی کے لئے سارے ستون بنائے گئے تھے، جن کو کچھ لوگ آج تک تھامے ہوئے ہیں۔ لیکن اب تو اپنی مرکزی حکومت ہے، اس لئے پرانے غلط اصطلاحوں پر سوچنا، کمزور سہاروں کے برابر ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ صوبائی عصبیت یا مقامی اور ذاتی مفاد کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا خودکشی کے برابر ہے۔"[4]

جناح صاحب نے 31 مارچ 1948ء کو ڈھاکہ میں واضح طور پر کہا کہ :

"آپ کے لئے لازم ہے کہ آپ بنگالی، سندھی، پنجابی، بلوچی اور پٹھان وغیرہ کی باتیں مت کریں، آپ فقط ایک قوم ہیں اور ایک ہی مملکت سے وابسطہ ہیں۔ یہ مملکت نہ پنجابی کی ہے، نہ بنگالی کی ہے، نہ سندھی کی اور نہ بلوچی کی ہے۔"(5)

اسی طرح 15 جون 1948ء کو کوئٹہ میں شہری سپاسنامے کے جواب میں انہوں نے کہا:

"ہم نہ بلوچی ہیں، نہ پٹھان، نہ سندھی، نہ پنجابی اور نہ بنگالی رہے ہیں۔ ہمارے احساس و عوامل سب پاکستانی ہونے چاہیئیں۔"(6)

اس کے علاوہ گیارہ اگست 1947ء کی اپنی مشہورِ زمانہ تقریر[7] میں جہاں ایک طرف انہوں نے اپنے ہی فرقہ پرست دو قومی نظرئے کو رد کرتے ہوئے ایک مثبت بات کی، وہاں انہوں نے پاکستانی قومیت کے غلط اور مفروضات پر مبنی خود فریب تصور پر زور دیا، جو کہ 1940ء کی قرارداد کی روح کے برعکس تھا۔ اس لئے مسلم لیگ نے اصل غداری سرسید، اقبال

---

(4) Jinnah: Speeches & Statements 1947-48، آکسفورڈ- 2000ء، صفحہ: 226

(5) ایضاً، صفحہ: 117

(6) ایضاً، صفحہ: 226

(7) ایضاً، صفحہ: 25

اور جناح سے نہیں بلکہ اختیارات کی مرکزیت مخالف جدوجہد، 1940ء کی قرارداد اور پاکستان میں شامل ہونے والی قوموں کے مابین سیاسی اور عمرانی معاہدے اور خاص طور پر مظلوم اقوام سے کی، جس میں جناح صاحب کے "کھوٹے سکوں" کے ساتھ خود ملک کے بانی محمد علی جناح صاحب کے کردار کو بھی ہر گز نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ کانگریس کی منافقانہ اور مرکزیت پسند کردار کی مزاحمت پر جہاں ان کے کردار کو سراہا جاسکتا ہے، وہاں "دو قومی نظریئے" کی تشکیل اور قیامِ پاکستان کے بعد صوبائی خود مختاری کو رد کرنے، "اردو" کو قومی زبان کے طور پر مسلط کرنے اور خود ساختہ مفروضاتی "ایک قومی نظرئے" پر زور دینے پر ان کو کسی بھی طرح درگذر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان پالیسیوں اور رویوں کے بدترین نتائج آج ہم بھگت رہے ہیں۔ جناح صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ ملک میں شامل تاریخی قوموں کے تشخص اور وجود سے انکار پر مبنی نام نہاد اور مفروضاتی پاکستانی قوم کے نام پر ان کے "کھوٹے سکے" اور ملک پر قابض پنجابی-اردو بولنے والے حکمران طبقات اور ان کی نمائندہ اسٹبلشمنٹ اس ملک کی مظلوم قوموں اور عوام کے ساتھ آگے چل کر کیا حشر کرینگے؟ آج جو بھی ملک کا یہ ہمہ گیر ریاستی بحران ہے، اس کی ایک اہم بنیاد یہ بھی ہے۔

پاکستان کی تاریخ اور قومی/ صوبائی خود مختاری کا سوال:

اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ پاکستان کبھی بھی عملی طور پر ایک جمہوری اور تمام قوموں/ صوبوں کا نمائندہ وفاق نہیں رہا اور حقیقی صوبائی خود مختاری کا ملکی تاریخ میں عملی طور پر وجود تو دور کی بات، تصور بھی موجود نہیں رہا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی پوری تاریخ اس ملک میں پنجابی-اردو بولنے والے حکمران طبقات، ان کی نمائندہ ملٹری-سول اسٹبلشمنٹ اور ان کے مقامی گماشتہ سرمائیداروں، وڈیروں، سرداروں اور جاگیرداروں کی سیاسی اجارہ داری، معاشی لوٹ مار اور مظلوم اقوام/ طبقات سے بدترین دھوکہ ہے، جس کو ثابت کرنے کے لئے مندرجہ ذیل مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

(1) 1947ء کا آزادی کا ایکٹ جو پی سی او (PCO) کے تحت عمل میں آیا، وہ 1935ء کے اس انڈین ایکٹ کی بنیاد پر قائم ہوا، جس کو اختیارات کی مرکزیت کی وجہ سے

مسلم لیگ نے پہلے رد کیا تھا۔ 1947ء کے آزادی ایکٹ" کے تحت پاکستان کے گورنر جنرل (محمد علی جناح) کو یہ اختیارات حاصل تھے کہ وہ عبوری دستور کو ترامیم کے ذریعے تبدیل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس "پاکستانی قومیت" کے غلط، خود فریب اور 1940ء کی قرارداد کی انحرافی پر مبنی مفروضے پر زور دیا۔

(2) 7 مارچ 1949ء کو ملک کے پہلے وزیراعظم اور نسلی و لسانی تعصب کے علمبردار لیاقت علی خان، جنہوں نے سیکیولر پاکستان کی نفی کر کے "قراردادِ مقاصد" (Objective Resolution) کا خاکہ پیش کیا۔ جس کو بعد میں 12 مارچ 1949ء کو ملک کی پہلی دستور ساز اسمبلی سے منظور کروایا گیا۔ "قرارداد مقاصد" جس کو آج تک پاکستان کی نظریاتی بنیاد کہا جاتا ہے، نے اصل میں پاکستان کو عملاً ایک مذہبی (Theocratic) اور اجارہ دار (Autocratic) ریاست میں تبدیل کر دیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ قراردادِ مقاصد دراصل ایک طرف 1940ء کی قرارداد کی روح اور جناح صاحب کی 11 اگست 1947ع کی تقریر کے خلاف سنگین مجرمانہ اور رجعت پسند عمل تھا، تو دوسری جانب وہ ایک ایسے پاکستان کی بنیاد اور نظریاتی خاکہ تھا، جس نے گذشتہ چھ دھائیوں سے ملک کی مظلوم اقوام اور عوام کا خون چوسا ہے۔

(3) 1949ء میں ہی اردو زبان کو زبردستی ملک کی باقی اقوام کے اوپر نام نہاد "قومی زبان" کے طور پر مسلط کیا گیا۔ اردو جو کہ ہندوستان میں تو کچھ مسلمان علاقوں کی مقبول زبان تھی، لیکن وہ پاکستان کی کسی بھی قوم یا علاقے کی تاریخی یا مادری زبان نہیں تھی، ملک میں ایک بہت بڑے ثقافتی تضاد کا سبب بن گئی۔ بدقسمتی سے پاکستان کی مظلوم قوموں کے ثقافتی استحصال کی بنیاد بھی خود ملک کے بانی محمد علی جناح اور لیاقت علی خان نے رکھی۔ جب انہوں نے بار بار اردو زبان کو ملک کی واحد قومی زبان کے طور پر مسلط کرنے پر زور دیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ کہ بنگال کی علیحدگی کی بنیاد اس دن سے ڈلی جب اردو کو ملک کی واحد قومی زبان کے طور پر مسلط کیا گیا۔ جب کہ 1956ء کے دستور میں اردو کے ساتھ بنگالی زبان کو بھی قومی زبان کا درجہ دیا گیا تھا لیکن تب تک بنگال کے دل میں پاکستان کی بنیادیں ہِل چکی تھیں۔ بہر حال بنگال تو بالآخر 1971ء میں اپنی بیحد قربانیوں کے نتیجے میں آزاد ہو گیا لیکن موجودہ پاکستان میں اردو کی

لسانی اور ثقافتی اجارہ داری ابھی تک برقرار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی لسانی اور ثقافتی اجارہ داری نے خود اردو زبان کو بھی سخت نقصان پہنچایا، کیونکہ بد قسمتی سے ایک خوبصورت زبان (اردو) پاکستان میں قوموں کے لئے متنازعہ بن گئی اور یہ تضاد آج تک جاری ہے۔ جب کہ اردو سمیت پاکستان کی تمام زبانوں کو قومی زبان کا درجہ دینے میں اردو سمیت تمام زبانوں کا مشترکہ مفاد پنہاں ہوتا۔

(4) 1955ء میں مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو زبردستی ملا کر "ون یونٹ" بنایا گیا، جس کے واضح طور پر دو مقاصد اور مفادات تھے۔ مشرقی پاکستان چونکہ آبادی کے لحاظ سے مغربی پاکستان سے بڑا تھا، اس لیے "پنجابی-اردو حکمران طبقات" کی نمائندہ سول ملٹری اسٹبلشمنٹ بنگال یعنی مشرقی پاکستان کے اکثریتی جمہوری حقِ حکمرانی کو صلب کرنا چاہتی تھی اور نام نہاد پیرٹی (Parity) کی بنیاد پر ون یونٹ کے قیام کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا۔ دوسرا یہ کہ اس حکمران ٹولے نے سندھیوں، بلوچوں، سرائیکیوں، پشتونوں اور تمام مظلوم طبقات کے تاریخی، معاشی اور سیاسی حقوق کو بھی مکمل طور پر پائمال کرنا چاہا۔ اسی تناظر میں ون یونٹ کا دوسرا بدنیت مقصد یہ بھی تھا۔ ون یونٹ کے ذریعے ایک طرف بنگال کی اکثریتی حیثیت کی نفی کرتے ہوئے ان کے حقِ حکمرانی کے جمہوری حق کی نفی کی گئی تو دوسری جانب اس سارے عرصے میں سندھیوں، بلوچوں، پشتونوں اور سرائیکیوں کے وسائل کو "مالِ غنیمت" سمجھ کر ان کی لوٹ مار کی گئی۔ ون یونٹ کے سب سے بدترین اثرات سندھ اور سندھیوں پر پڑے، جس میں ان کی زمینوں، شہروں، پانی، خزانے، وسائل، ڈیموگرافی کے توازن اور تاریخی حقوق پر وہ بدترین ڈاکے ڈالے گئے، جن کا ازالہ یا سدِ باب اب شاید کبھی بھی ممکن نہ ہو سکے۔

(5) پاکستان میں اب تک چار مارشلا لگ چکے ہیں۔ جن کا کل حکومتی عرصہ 33 برس ہے۔ یعنی ملک کی 70 سالہ تاریخ میں سے 33 سال ملک میں ننگی آمریت رہی ہے۔ جنرل ایوب خان کا آمریتی عرصہ 8 اکتوبر 1958ء سے لیکر 25 مارچ 1969ء (دس برس پانچ مہینے اور تین دن) تک چلا، جنرل یحیٰ خان کا آمریتی عرصہ 25 مارچ 1969ء سے لیکر 19 دسمبر 1971ء تک چلا (2 سال 9 مہینے اور 6 دن)، جنرل ضیاء الحق کا آمریتی عرصہ 5 جولائی 1977ء سے لیکر

16اگست 1988ء تک رہا(11 سال ایک مہینہ اور 11 دن) اور جنرل پرویز مشرف کا آمریتی دؤر 12 اکتوبر 1999ء سے 2008ء(9 سال) تک چلا۔

یوں تو ملک میں آمریتی حکومتوں نے جمہوریت، جمہوری اداروں، قانون کی حکمرانی اور احترام، میڈیا کی آزادی، عوام کی سیاسی آزادی، سیاسی کلچر اور ریاست و عوام کے اعتماد کو مکمل طور پر تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، جس کے نتائج آج بھی ملک کی ہر سطح پر دیکھے جا سکتے ہیں، لیکن دوسری جانب حقیقت یہ ہے کہ ملک کے آمریتی ادوار میں سب سے زیادہ سیاسی اور معاشی کرب مظلوم قومیتوں خصوصاً سندھیوں، بلوچوں، پشتونوں اور سرائیکیوں اور مجموعی طور پر تمام عوام اور مظلوم طبقات نے جھیلے ہیں۔۔ جیسا کہ ملک کی ملٹری اور سول اسٹبلشمنٹ اور ریاست پر قابض طبقے کی اکثریت کا تعلق سینٹرل پنجاب سے ہے، اس لئے آمریتی ادوار میں بھی ایک طرف اسٹبلشمنٹ نے پنجاب کے حکمران طبقے اور اردو بولنے والے حکمران طبقے اور ان کے مقامی گماشتہ سرمائیداروں، وڈیروں، سرداروں اور جاگیرداروں کو نوازا تو دوسری جانب سویلین حکومتوں کی نسبت مظلوم قوموں اور خصوصاً سندھیوں، بلوچوں اور سرائیکیوں کا سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی استحصال کیا ہے۔ پاکستان میں آبادی کے اعتبار سے چھوٹے صوبوں اور ان میں بسنے والی قوموں کو تو یوں بھی کبھی حقیقی قومی/ صوبائی خود مختاری نصیب نہیں ہوئی لیکن آمریتی ادوار میں تو ان کا تصور بھی ممنوع رہا ہے۔ اس لئے پاکستان کے سارے آمریتی ادوار بدترین مرکزیت پسند حکومتی نظام رہے ہیں۔ اب تصور کیا جا سکتا ہے کہ ملک کی ۷۰ سالہ تاریخ میں جب 33 سال ننگی آمریت رہی ہو تو اس میں صوبوں، ان میں بسنے والی مظلوم قوموں کی قومی/ صوبائی خود مختاری کا کیا حشر ہوا ہو گا؟ اس لئے ہی شاید ہمیشہ آمریتوں کو بالادست صوبے پنجاب میں نہیں بلکہ چھوٹے صوبوں خصوصاً سندھ ہی سے مضبوط مزاحمت کا سامنا رہا ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ آمریتوں کے بعد بھی منتخب سیاسی حکومتوں میں چونکہ مظلوم قوموں اور چھوٹے صوبوں کو کچھ بھی نہیں ملا، اس لئے اب مظلوم قوموں کے عوام کی اکثریت سیاسی حکومتوں سے بھی آہستہ آہستہ لاتعلق ہوتی جا رہی ہے۔ کیونکہ ملک میں آمریتیں ہوں یا بے اختیار سویلین حکومتیں، حکومتی ایوانوں میں پارٹیاں تبدیل ہوں یا چہرے

لیکن ریاست کے بنیادی ڈھانچے، طاقت کے توازن، اختیارات کی ساخت، قانون کی حکمرانی اور ملکی کاروبار میں حکمران طبقات کی اجارہ داری میں کوئی بھی فرق نہیں پڑتا۔اس لئے دیکھا جا سکتا ہے کہ مشرف دوٗر میں سندھ اور بلوچستان نے پانی، مالیاتی اور قدرتی وسائل پر اختیار کے لئے توانتھک جدوجہد اور مزاحمت کی لیکن اس بار ان کی جدوجہد کے محرکات، موضوعات اور مفادات کچھ اور تھے۔

پاکستان کے دساتیر اور قومی/ صوبائی خود مختاری:

پاکستان کی آئینی تاریخ خود اس ملک کے عوام اور مظلوم قوموں کے ساتھ ایک سنگین مذاق کے مترادف ہے۔ 12 مارچ 1949ء کو جس دن ملک کی پہلی دستور ساز اسمبلی سے "قراردادِ مقاصد" کو پاس کروایا گیا،اس دن چوبیس ممبران پر مشتمل ایک "بنیادی اُصولوں کی کمیٹی" کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ "قراردادِ مقاصد" کی بنیاد پر ملک کے دستور کے لئے سفارشات ترتیب دیگی۔اس کمیٹی کی سنجیدگی کا عالم یہ تھا کہ اس نے چھ سال کے بعد جا کر 1954ء میں اپنی سفارشات پیش کیں۔اس دوران میں قراردادِ مقاصد کے خالق اور ملک کے سیکیولر مستقبل کو مجروح کرنے والے وزیراعظم لیاقت علی خان 16 اکتوبر 1951ء کو قتل کر دیے گئے اور ان کی جگہ خواجہ ناظم الدین نے دوسرے دن یعنی 17 اکتوبر کو ملک کی وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا۔1954ء میں جب کمیٹی نے اپنی آئینی سفارشات ترتیب دیں تب تک خواجہ ناظم الدین بھی اقتدار کے مسند سے رخصت ہو کر گھر جا چکے تھے اور محمد علی بوگرہ نے قلمدان سنبھال لیا تھا۔ لیکن جب تک ان سفارشات کا ڈرافٹ منظوری کے لئے اسمبلی میں پیش ہوتا،اس سے پہلے 24 اکتوبر 1954ء کو ملک کے گورنر جنرل غلام محمد نے اسمبلی ہی کو برطرف کر کے پاکستان کی غیر جمہوری پارلیمانی تاریخ کی بنیادیں رکھ دیں۔اسمبلی کے صدر مولوی تمیزالدین نے اس فیصلے کو سندھ چیف کورٹ میں چیلنج کیا اور بالآخر وہ کیس جیتا لیکن حکومت نے پھر سے ردعمل میں وفاقی کورٹ سے رجوع کیا اور چیف جسٹس محمد منیر نے اپنا مشہور اور بدنام زمانہ فیصلہ سُنایا، جس کے نتیجے میں مولوی تمیزالدین نے تو کیس ہارا لیکن پاکستان کی تاریخ میں عدلیہ کے نئے اور مخصوص موقعہ پرست کردار کی بنیاد پڑی۔ جس میں

بنیادی اہمیت قانون، دستور اور جمہوری اُصولوں کی بجائے "نظریہءِ ضرورت" کو تھی۔ "نظریۂ ضرورت" کی غلام عدلیہ اس ملک میں جمہوریت، دستور، قانون، انصاف اور جمہوری وفاق یا صوبوں اور ان میں بسنے والی مظلوم قوموں کے حقوق کو کیا تحفظ دے سکتی تھی، یہ حقیقت پاکستان میں ایک کھلا راز ہے۔

1956ء میں پاکستان کو بالآخر اپنا پہلا دستور ملا، جس میں ایک طرف ملک کو آئینی طور پر "اسلامی جمہوریہ پاکستان" قرار دیا گیا تو دوسری جانب ملک میں سینٹ کے بغیر (Unicameral) پارلیمانی جمہوری نظام کو متعارف کروایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ 1962ء اور 1973ء کے دساتیر کی نسبت 1956ء کے دستور میں زیادہ صوبائی خود مختاری دی گئی تھی لیکن چونکہ مغربی پاکستان میں ون یونٹ تھا، لحاظ وہ صوبائی خود مختاری مشرقی بنگال، سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخواہ کے لئے نہیں بلکہ عملی طور پر پنجاب کے ہی کام آئی۔

یہ دستور ملک کی دوسری دستور ساز اسمبلی کی طرف سے دیا گیا، جو کہ 28 مئی 1955ء کو گورنر جنرل کے آرڈر نمبر 12، 1955ء کے تحت وجود میں آئی تھی۔ اس اسمبلی کو ون یونٹ کے نفاذ کا بھی "اعزاز" حاصل ہے۔ چودھری محمد علی اُس وقت ملک کے وزیر اعظم تھے اور 1956ء کا دستور جس کا ڈرافٹ 9 جنوری 1956ء کو پیش کیا گیا، وہ 29 فروری 1956ء کو اسمبلی سے پاس کروایا گیا، اور 23 مارچ 1956ء سے وہ دستور نافذ کیا گیا۔ تاریخ کا یہ اتفاق اپنی جگہ موجود ہے کہ یہ وہ ہی تاریخ تھی جب لاہور کے منٹو پارک میں 1940ء میں مسلم لیگ کی جانب سے تاریخی قرارداد پیش کی گئی تھی، جس کو پاکستان کی بنیاد بھی کہا جاتا ہے۔

1962ء میں ملک کو دوسرا دستور ملا، جو کہ ایوبی آمریت کی بدترین اجارہ داری کا دَور تھا۔ ایوب خان جس نے 27 اکتوبر 1958ء کو ملک کے دوسرے صدر کے طور پر اقتدار سنبھالا، 17 فروری 1960ء کو ایک کمیشن کا قیام عمل میں لائے، جس کا مقصد پھر ایک نئے دستور کے لئے سفارشات ترتیب دینا تھا۔ ہر آمر کی طرح ایوب خان کو بھی "جمہوریت" کی بڑی فکر تھی اور اس نے "بنیادی جمہوریت" کو "سپورٹ" کرنے کے لئے ایک نیا آئینی ڈھانچہ دینا چاہا۔ بالآخر اس کے بنائے ہوئے آئینی کمیشن نے 29 اپریل 1961ء کو اپنی رپورٹ پیش کی، جس

کی بنیادپر 1 مارچ 1962ء کو ملک کے پہلے آمر کی طرف سے پاکستان کو دوسرا دستور ملا۔ 1962ء کے دستور میں پاکستان کو صدارتی حکومتی نظام دیا گیااور بجاطور پہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک آمر کی طرف سے ایک آمر کے لئے،ایک آمر کا دیا ہوا دستور تھا۔اس لئے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس دستور نے ملک میں جمہوری وفاق،صوبوں اور ان میں بسنے والی قوموں کے تاریخی حقوق اور خود مختاری کی کتنی "خدمت" کی ہوگی!

پاکستان کی منتخب جمہوری پارلیمنٹ کی معرفت پہلا دستور 1973ء میں ملا، جس کا کریڈٹ شہید ذوالفقار علی بھٹو کو دیا جاتا ہے، جو کہ ایک حقیقت بھی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا 1973ء کا دستور واقعی بھی ملک میں تمام قوموں کے قومی،تاریخی اور جمہوری حقوق کا پاسدار، صوبوں کو خود مختاری کی ضمانت دینے والا ایک بااُصول جمہوری وفاقی دستور تھا؟ جواب ہے کہ بالکل نہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی رہ جانے والی اسمبلی کو کوئی بھی آئینی اور اخلاقی اختیار نہ تھا کہ وہ بغیر مینڈیٹ کے نیا دستور بنائے۔ کیونکہ یہ اختیار تو دستور ساز اسمبلی کو ہوتا ہے، جو کہ مشرقی بنگال کی آزادی کے بعد ٹوٹ چکی تھی۔اس لحاظ سے اُصولی طور پر خود یہ دستور ہی غیر آئینی ہے۔1973ء کا دستور اپنے بنیادی مزاج میں قراردادِ مقاصد کی توثیق وتائید کرنے والا، قوموں کے وجود کا انکاری، خود فریب اور گمراہ کن پاکستانی قومیت کے تصور کا علمبردار ایک ایسا دستور تھا، جس میں پارلیمانی نظام کے ذریعے ایک بے اختیار سینٹ کو تو پیدا کیا گیا، لیکن صوبوں اور ان میں بسنے والی تمام قوموں کے تاریخی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی حقوق کا کوئی بھی لحاظ نہیں کیا گیا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ 1973ء کا دستور دراصل 1935ء کے سامراجی انڈین ایکٹ کا نئے حالات میں ایک تسلسل تھا، بلکہ 1973ء کے دستور میں تو 1935ء کی نسبت صوبوں کو کم خود مختاری دی گئی تھی۔المیہ کی بات یہ بھی ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے سب سے بڑے سحر انگیز عوامی رہنما شہید ذوالفقار علی بھٹو بنیادی طور پر صوبوں اور ان میں بسنے والی تاریخی قوموں کی خود مختاری کے حامی نہیں بلکہ ایک سخت مرکزیت پسند سیاسی رہنما تھے۔ 1973ء کے دستور کا چہرہ مسخ ہونے کا آغاز بھی خود شہید ذوالفقار علی بھٹو کے اپنے دوَر سے ہوا

اور بعد میں ضیاءُالحق سے نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف تک آٹھویں اور سترھویں ترامیم کے ذریعے اس کا چہرہ مسخ کرنے میں کسی نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

جمہوری وفاقیت کا بحران اور قومی/ صوبائی خود مختاری کے مسائل:

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ پاکستان کی پوری تاریخ میں کبھی بھی حقیقی جمہوری وفاق کا عملاً کوئی وجود نہیں رہا، جس کے نتیجے میں وفاق اور صوبوں اور بڑے بالادست صوبے پنجاب اور چھوٹے صوبوں میں آباد مظلوم اقوام کے مابین سنگین تضادات موجود رہے ہیں، جن کا تصفیہ کبھی بھی انصاف کی بنیاد پر نہیں کیا گیا۔ آج تک یہ بحران جوں کا توں موجود ہے۔ پاکستان میں وفاقیت کے بحران کے حوالے سے چند بنیادی پیچیدہ اشوز یہ ہیں۔

(الف) وفاق میں پنجاب کی اجارہ داری اور بالادستی:

دنیا کے کثیر قومی یا کثیر ریاستی نظاموں میں وفاق دراصل قوموں یا ریاستوں کے درمیاں ایک مشترکہ مفاد کے حامل الحاق یا معاہدے کا نام ہوتا ہے لیکن پاکستان میں وفاق پر مکمل طور پر ایک بالادست صوبے/ قوم یعنی پنجاب کے حکمران طبقے کی عسکری، سیاسی اور معاشی اجارہ داری ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ بنگال کی جبراً علیحدگی کے بعد پاکستان میں پنجاب کو دیگر شعبوں کے علاوہ خود پارلیمنٹ میں بھی مستقل عددی اکثریت حاصل ہے۔ سینٹ کو 1973ء کے دستور کے تحت وجود میں تو لایا گیا لیکن اس بے اختیار سینٹ کی عملی حیثیت ایک سیاسی کلب سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ ملک کے تینوں فوجی اداروں (بری، بحری اور ہوائی) کے اندر قطعی اکثریت سینٹرل پنجاب اور اہلِ پنجاب کی ہے۔ پاکستان کی سول بیوروکریسی میں آج بھی قطعی اکثریت پنجابی اور اردو بولنے والوں کی ہے۔ عدلیہ کی صورتحال بھی یہی ہے، جہاں اعلیٰ عہدوں پر سندھی خصوصاً بلوچ نظر نہیں آتے۔ ملک کے نام نہاد وفاقی اداروں اور کارپوریشنس میں سندھی، بلوچ اور سرائیکی آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ البتہ پشتونوں کی نمائندگی ایک حد تک ملک کی ملٹری اور سول بیوروکریسی میں شروع سے موجود رہی ہے۔ لیکن مظلوم اور مفلس الحال پشتون عوام کی صورتحال اس سے کبھی بہتر نہیں ہوئی ہے۔ اداروں کے لحاظ سے جیسا کہ وفاق پر عملی طور پر قبضہ پنجابی اور اردو بولنے والے حکمران طبقات کا ہے، اس لئے

مرکز میں خواہ کوئی بھی حکومت ہو لیکن وفاقی مرکز عملی طور پر ان ہی مراعت یافتہ اور بالادست طبقات کے ناجائز مفادات کی پاسداری اور حفاظت کرتا رہتا ہے۔ پنجاب کے کچھ شاؤنسٹ حلقوں اور دانشوروں کی جانب سے اکثر کہا جاتا ہے کہ ایوب خان اور یحیٰ خان پشتون تھے اور مشرف بھی ایک غیر پنجابی یعنی اردو بولنے والا تھا اور ضیاء الحق ایک کشمیری تھا، اس لئے ریاستی جبر کا قصور پنجاب کو کیوں دیا جاتا ہے؟ یا پھر یہ کہا جاتا ہے کہ سندھی پیپلز پارٹی کی صورت میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد گاہے بہ گاہے اقتدار میں رہے ہیں لیکن پھر بھی پنجاب کی اجارہ داری کے خلاف شکوہ کیا جاتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اصل سوال اقتدار کی مسند پر بیٹھنے والے افراد کی زبان، نسل، صوبے اور قومیت کا نہیں ہے، بلکہ ریاست کے ڈھانچے، اس میں طاقت کے توازن اور پاور اسٹرکچر کا ہے۔ اس ملک کے موجودہ ریاستی ڈھانچے اور موجودہ استحصالی نظام کے اندر جو بھی اقتدار میں آئے گا، وہ اسٹبلشمنٹ اور پنجاب کے حکمران طبقے کے ناجائز مفادات سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ پاکستان میں غیر جمہوری ادوار میں مسند پر بیٹھا ہوا ایوب خان ہو یا یحیٰ خان، ضیاءُالحق ہو یا پرویز مشرف، وہ صرف کوئی فرد نہیں بلکہ اس اسٹبلشمنٹ کے نمائندے ہوتے ہیں، جو کہ پنجاب کے حکمران طبقے اور ان کے ذیلی حواریوں (خصوصاً اردو بولنے والے حکمران طبقے) کے ہی ناجائز اور مراعت یافتہ مفادات کا تحفظ کرنے والا ہوتا ہے۔ دوسری جانب منتخب حکومتوں میں بھی کوئی بھی سویلین حکمران ہو، وہ پنجاب کے ناجائز اور بالادست مفادات کو پورا کیے بغیر نہ تو اقتدار میں آ سکتے ہیں اور نہ حکومت کی مسند پر بیٹھ سکتے ہیں۔ نتیجے میں ملک کی مظلوم قوموں نے کبھی بھی پاکستان کے وفاق کو اپنا نمائندہ وفاق نہیں سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی بنگال کی علیحدگی کے بعد موجودہ پاکستان وہ پاکستان ہے ہی نہیں جس کی حمایت میں 3 مارچ 1943ء کو جناب جی۔ ایم۔ سید نے سندھ اسمبلی سے قرارداد منظور کروائی تھی۔ عملی طور پر بنگال کی علیحدگی کے بعد یہ وہ ملک ہے جس کا خاکہ علامہ اقبال نے 1930ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے اکیسویں اجلاس میں پیش کیا تھا اور جس کو اس بنیاد پر خود مسلمانوں نے رد کیا تھا کہ اس کا عملی طور پر مطلب "گریٹر پنجاب" ہوگا۔

(ب) ریاست کا ڈھانچہ اور طاقت کا توازن:

پاکستان کا ریاستی ڈھانچہ، اختیارات کی حد بندی اور اس میں طاقت کا توازن ہی ایسا ہے کہ جس میں ملک کی مظلوم قوموں کو موجودہ نام نہاد "وفاقی اور جمہوری" ڈھانچے کے اندر قومی خود مختاری مل ہی نہیں سکتی، کیونکہ ایک طرف ریاست پر قابض اسٹبلشمنٹ اور حکمران طبقے کا تعلق پنجابی -اردو مستقل مفاد سے ہے تو دوسری طرف ملک کی پارلیامینٹ میں بھی پنجاب کی قطعی عددی اکثریت ہے۔ سینٹ میں گرچہ بظاہر صوبوں کی برابر نمائندگی ہے لیکن ایک تو یہ ایوان بے اختیار ہے دوسرا اس میں وفاق کے انتظام میں چلنے والے علاقوں جیسا کہ فاٹا وغیرہ کی نشستیں بھی عملی طور پر اسٹبلشمنٹ کے ہاتھوں میں رہی ہیں اور تیسرا یہ کہ سینٹ میں صوبوں کی بظاہر Token نمائندگی تو نظر آتی ہے لیکن اس میں بسنے والی تاریخی قوموں جیسا کہ سندھیوں، پشتونوں، سرائیکیوں اور بلوچوں کی نمائندگی کبھی بھی مؤثر نہیں رہی۔ سول بیورو کریسی کا تعلق بھی اسی حکمران ٹولے سے ہے۔ جب کہ 1940ء میں محض صوبائی خود مختاری کی بات نہیں کی گئی تھی بلکہ ریاستی و قومی خود مختاری کی بات پر اتفاق کیا گیا تھا اور دوسرے یہ کہ جب صوبے کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ صوبے محض انتظامی یونٹ نہیں بلکہ پاکستان کو تشکیل دینے والی تاریخی قوموں کے وطن ہیں، اس لئے اس کا مطلب صوبوں میں بسنے والی تاریخی قوموں کی قومی خود مختاری ہے لیکن جس ملک میں قوموں کے وجود، ان کی تاریخی حیثیت اور حقوق سے فقط زبانی ہی نہیں بلکہ آئینی طور پر بھی انکار کیا گیا ہو، وہاں کون سی قومی حقوق کی پاسدار حقیقی صوبائی خود مختاری کی امید کی جاسکتی ہے؟ اس لیے ملک میں حقیقی جمہوریت اور ریاستی تضادات کا حل تب ہی نکل سکتا ہے جب ریاست کی خالق قوموں کے درمیاں ایک نئے عمرانی اور سیاسی معاہدے کی تشکیل کی جائے۔

(ت) قومی حقِ حاکمیت اور سندھ:

آج کے جدید دوَر میں کوئی بھی قوم، قومی خود مختاری، حقِ حاکمیت اور مظلوم طبقات کی نجات کے بغیر نہ تو آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ ہی آزاد اور خود مختار حیثیت کے بغیر ترقی کر سکتی ہے۔ پاکستان دنیا کا وہ وفاقی ملک ہے، جہاں مظلوم اور زیر دست قوموں نے ملک میں شامل ہو کر، ایک لحاظ سے نہ ختم ہونے والی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال دیا۔ قوموں کے تاریخی

وجود کے انکاری اس ملک میں قومی خود مختاری و حقِ حاکمیت کا تو تصور ہی بغاوت سمجھا جاتا ہے۔ سات دھائیاں گذرنے کے باوجود بھی قومیں ابھی تک اپنا قومی وجود اور تشخص منوانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں، جب کہ ان کی سیاسی، معاشی اور ثقافتی قومی خود مختاری کی بات تو ابھی بہت دور ہے۔

1843ء میں انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد اس کو جبراً بمبئی پریزیڈنسی میں شامل کر دیا۔ ۸۸ سالہ طویل اور مسلسل جدوجہد کے بعد سندھ نے بالآخر 1935ء کے انڈین ایکٹ کے تحت یکم اپریل 1936ء کو اپنی صوبائی حیثیت حاصل کی۔ اگرچہ 1935ء کے مرکزیت پسند انڈین ایکٹ کے تحت ہی سہی لیکن بہر حال سندھ کو 37-1936ء سے 47-1946ء تک محدود صوبائی خود مختاری کے دس برس ملے لیکن تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ اس ایک دھائی میں تین انتخابات اور پانچ وزارتِ اعلیٰ کے قلمدانوں کی تبدیلیوں اور بدترین داخلی سیاسی انتشار کی وجہ سے سندھ کو عملی طور پر ایک دن بھی خود مختاری سے فیضیاب ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ یہ پوری دھائی سندھ میں اسمبلی کے اندر باہمی دشمنی کی مانند سیاسی انتشار موجود رہا۔ وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں، منصب اور چہرے تبدیل ہوتے رہے، لیکن عملی طور پر سندھ کو جزوی خود مختاری بھی نصیب نہیں ہوئی، جس میں ان کی حکومت آزادی، خود مختاری اور ذمہ داری کے ساتھ سندھ اور اس کے عوام کے لئے کوئی بنیادی اقدام لے سکتی۔ تاریخ کا عجب اتفاق یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں بھی سندھ میں حکمرانی کا وہ ہی فارمولا مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، جس میں اکثریتی اور وطن دوست سیاسی فریق کو دور رکھ کر انگریز، مسلم لیگ اور کانگریس کے مرہون منت سیاسی اقلیتی ممبران کو سندھ کے اقتدار کی باگ ڈور دی جاتی رہی۔ مثلاً فروری 1937ء کے انتخابات کے جو نتائج سرکاری طور پر ظاہر کیئے گئے اُن میں جناب جی ایم سید کی سربراہی میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی کو 22 نشستیں، سندھ ہندو سبھا (جس کا بعد میں اسمبلی میں نام تبدیل کر کے "ہندو انڈیپینڈنٹ پارٹی" رکھا گیا) کو 11 نشستیں، انڈین نیشنل کانگریس کو 8 نشستیں، آزاد ممبران (دو ہندو اور چھ مسلم) کو 8 نشستیں، یورپی ممبران کو 3 نشستیں اور مزدوروں کو ایک نشست ملی، لیکن سندھ میں انگریز گورنر سر لینسی لاٹ گراہم نے

اکثریتی پارٹی کو چھوڑ کر انگریز سرکار کے منظورِ نظر سر غلام حسین ہدایت اللہ کو سندھ میں وزارت بنانے کی دعوت دی۔ جس کے پاس صرف چار نشستیں تھیں۔[8] یہ تو محض ایک مثال ہے۔ یہاں تک کہ 47-1946ء تک سندھ میں حکومتوں کی یہ ہی صورتحال رہی اور حقیقی معنوں میں سندھ ان دس برسوں میں ایک دن بھی عملی طور پر قومی تو کُجا لیکن محض جزوی صوبائی خود مختاری بھی حاصل نہ کر سکی۔

پاکستان کے قیام کے بعد تو کسی بھی حکومت یا دوَر کو ایسی حکومت یا دوَر نہیں کہا جا سکتا، جس میں سندھ کو قومی تو کیا محض رسمی صوبائی خود مختاری بھی ملی ہو۔ آج سندھ میں انتظامی اہلیت، انفراسٹرکچر، تعلیم، صحت، غربت اور حکومتی سطح پر جس اعتماد اور اہلیت کا بحران ہے، اس کا بنیادی سبب سندھ کا مسلسل قومی خود مختاری اور حقِ حاکمیت سے دور رہنا بھی ہے۔ تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ انگریزوں سے پہلے میر صاحبان کے دوَر کو بھی حکمرانی کا ایسا دوَر نہیں کہا جا سکتا، جس میں سندھ کو حقیقی قومی خود مختاری حاصل رہی ہو۔ کیونکہ میر صاحبان کو قومی حکومت چلانے کا نہ تو تجربہ تھا اور نہ ہی ان میں ایسی انتظامی اہلیت اور جدید سیاسی بصیرت تھی۔

پاکستان کے قیام کے بعد اور موجودہ حالات میں قومی خود مختاری یا حقِ حاکمیت کے حوالے سے سندھی قوم سب سے زیادہ مظلوم رہی ہے۔ پاکستان میں کسی بھی قوم کے تاریخی شہر اس طرح ان سے نہیں چھینے گئے اور دوسری آبادیوں کے قبضے میں آئے، جس طرح سندھیوں اور ان کے تاریخی شہروں کے ساتھ ہوا۔ پاکستان میں کسی اور قومیت کی آبادی کا تناسب اس طرح سے نہیں تبدیل کیا گیا، جس طرح سندھ میں سندھیوں کے ساتھ ہوا کہ آج سندھی اس اجتماعی خوف اور عدم سلامتی کا شکار ہیں کہ وہ اپنے تاریخی وطن سندھ میں ایک اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائیں۔ پاکستان میں کسی بھی قومیت کی زمینوں، قدرتی اور مالیاتی وسائل اور پانی کی لوٹ کھسوٹ نہیں کی گئی، جیسا کہ سندھیوں کے ساتھ ہوا۔ دوسری طرف ایک تو اسٹبلشمنٹ اور پنجاب کا حکمران طبقہ کسی بھی صورت میں سندھ سمیت تمام مظلوم اور زیردست قوموں کو

---

[8] محمد ابراہیم جویو، "سندھ منھنجے خوابن جی"، 2008ء، سینٹر فار پیس اینڈ سول سوسائٹی، حیدرآباد، صفحہ: 9

قومی خود مختاری دینے کے لئے تیار نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ کسی بھی صوبے میں ایم کیو ایم کی صورت میں ایسا شہری نسل پرست، دہشتگرد اور فاشسٹ فتنہ نہیں پیدا کیا گیا ہے اور نہ موجود ہے، جیسا کہ ضیاءُالحق کے دوٗر سے سندھ میں پیدا کیا گیا ہے۔ صرف گذشتہ 34 برسوں کا حساب کتاب کیا جائے تو ایم کیو ایم کے قیام سے لے کر پرویز مشرف کے دوٗر تک سندھ میں عملی طور پر حقیقی اقتدار ایم کیو ایم کا رہا ہے اور مجال ہے کہ پ پ پ سے لیکر کوئی بھی اقتدار پرست ٹولہ ان سے موں موڑنے کی گستاخی اور جرئت بھی کر سکے۔ اس لئے ایک بات واضح ہونی چاہیئے کہ صوبائی خود مختاری کا عملی طور پر کوئی بھی مطلب نہ ہوگا جب تک وہ خود مختاری اصل اور تاریخی قوموں کے حقِ حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتی اور اس کو عملی طور پر یقینی نہیں بناتی۔ یعنی دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ صوبے قوموں کے تاریخی وطن ہیں اور صوبائی خود مختاری اگر اپنے جوہر میں حقیقی قومی خود مختاری نہیں ہے اور اس میں خود مختاری اصل قوموں کی بجائے چند مراعت یافتہ گروہوں کو حاصل ہوگی تو پھر وہ ایک دھوکے کے سوا کچھ بھی نہ ہوگی۔ ویسے بھی صوبے تو انگریزوں نے بنائے، جو کہ بعد میں پاکستان نے برقرار رکھے۔ 1940ء میں تو آزاد اور خود مختار ریاستوں کی بات ہوئی تھی۔ سندھ کو جب انگریزوں نے فتح کیا تو ہم محض صوبے نہ تھے، بلکہ ایک آزاد قوم اور وطن تھے۔ اس لئے سندھ سندھیوں کا محض صوبہ نہیں بلکہ تاریخی قومی وطن ہے اور سندھیوں کے لئے قومی خود مختاری کے بغیر ایسی صوبائی خود مختاری بے معنی ہے، جس میں ان کا حقِ حاکمیت عملی طور پر تسلیم نہ کیا جائے۔

دوسری طرف ایک تو سندھی قوم پہلے ہی حقِ حاکمیت سے محروم رہی ہے اور دوسرے پرویز مشرف کے بدنیت نام نہاد لوکل حکومتی نظام نے بھی عملی طور پر سندھیوں کو جزوی خود مختاری سے بھی محروم کر دیا ہے۔ نسل پرست اور آمر پرویز مشرف کے پیدا کیئے ہوئے اس بدنیت ضلعی حکومتی نظام کی وجہ سے ایک طرف سندھ کے شہروں کو مکمل طور پر نسلی دہشتگردوں کے رحم و کرم پر چھوڑا گیا اور ان کی انتظامی سیاسی بالادستی میں دیا گیا تو دوسری طرف سندھ کے تمام اضلاع کو مقامی طور پر اسلام آباد کے غلام وڈیروں کی سیاسی جاگیروں میں تبدیل کر دیا گیا۔

قوموں کی آئینی خود مختاری:

خود مختاری محض کوئی لفظ یا اصطلاح نہیں ہے بلکہ آج کے جدید دؤر میں ایک ایسا بنیادی اُصول اور افراد خواہ اقوام کا جمہوری حق ہے، جس کو جب تک آئینی تحفظ اور ضمانت حاصل نہ ہو، تب تک وہ بے معنی ہے۔ پاکستان کے مرکزیت پسند اور اجارہ داری پر مبنی ریاستی ڈھانچے اور نظام کے علمبردار اس کے تمام دساتیر (1947ع آزادی کا ایکٹ، 1956ع، 1962ع، اور 1973ع) ہیں، جو کہ برطانوی سامراج کی مرکزیت پسند اور خود مختاری مخالف سامراجیت کا تسلسل ہیں، جس کا مختصر ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

پاکستان میں صوبائی خود مختاری کا تب تک کوئی بھی مطلب، وزن یا اہمیت نہیں ہے، جب تک قوموں کے خود مختار تاریخی وجود کو تسلیم کر کے، اس کو مکمل طور پر دستور کا حصہ بنا کر، انہیں قومی خود مختاری کی آئینی ضمانت نہیں دی جاتی۔ اس لئے ہی ملک کے زیادہ تر سنجیدہ لوگوں کا مطالبہ رہا ہے کہ 1973ء کا مسخ شدہ اور بار بار مجروح کیا ہوا دستور جو کہ ویسے بھی اپنے آغاز سے ہی مرکزیت پسند تھا، اس میں جزوی ترامیم کے ذریعے ملک کے تمام صوبوں اور ان کی مظلوم قوموں کو، کوئی حقیقی قومی خود مختاری ملنا دشوار ہے، کیونکہ اس کی بنیاد ہی قوموں کے وجود سے انکار اور مرکزیت پسندی پر مبنی ہے۔ اس لیئے بہتر حل یہ ہو گا کہ ایک نئی دستور ساز اسمبلی کا قیام عمل میں لایا جائے اور پھر اس اسمبلی سے ایک دستور پاس کروایا جائے، جس کی بنیاد وفاقیت کے تسلیم شدہ بین الاقوامی اُصولوں اور 1940ء کی قرارداد پر مبنی ہو، جو دستور قوموں کے درمیاں ایک نئے عمرانی اور سیاسی معاہدے کی حیثیت رکھتا ہو۔

معاشی خود مختاری:

قومی مالیاتی کمیشن اور مظلوم قوموں/ چھوٹے صوبوں کا معاشی استحصال:

دنیا میں جہاں کہیں بھی کثیر قومی یا کثیر ریاستی وفاقی رائج نظام ہے، وہاں وفاق میں ایک ساتھ رہنے والی قوموں، ریاستوں یا صوبوں کے درمیاں مالیاتی وسائل کی منصفانہ تقسیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے، جس کو معاشی وفاقیت (Fiscal Federalism) یا معاشی

عدم مرکزیت (Fiscal Decentralization) بھی کہا جاتا ہے۔ ایسی جمہوری وفاقی ریاستوں میں یہ استحقاق قوموں یا ریاستوں/ صوبوں کا ہوتا ہے کہ وہ مل کر طئے کریں کہ وفاق کو اپنا انتظام چلانے کے لئے کتنے وسائل دیئے جائیں؟ کیونکہ وفاق تو ایک معاہدہ اور انتظامی نظام کا نام ہے، جب کہ اس کی اکائیاں قوموں یا ریاستوں/ صوبوں پر مشتمل ہوتی ہیں، لیکن پاکستان دنیا کا وہ وفاق ہے، جہاں اُلٹی گنگا بہتی رہی ہے۔ سات دھائیاں گذر جانے کے باوجود پاکستان میں وفاقی ڈھانچہ برطانوی آبادیاتی (British Colonial) طرز کا ہے۔ جس کی بنیاد اختیارات کی مرکزیت اور مخصوص ناجائز مفادات پر مبنی ہے۔

قومی مالیاتی کمیشن ایوارڈ (NFC) پاکستان میں شروع سے متضاد اور متنازعہ رہا ہے، کیونکہ یہ محض پنجاب کے مفادات کے تحت بنتا رہا ہے۔ جب مشرقی بنگال ہمارے ساتھ تھا اور وہ آبادی کے تناسب کے حساب سے پورے مغربی پاکستان سے بڑا تھا، تب این ایف سی ایوارڈ کی بنیاد آبادی پر نہیں بلکہ ریونیو اور زمینی ایراضی (Inverse Pupulation Density) پر تھی۔ کیونکہ پنجاب صرف اس صورت میں ہی ملکی وسائل کا استحصال کر سکتا تھا، کیونکہ آبادی میں مشرقی پاکستان اکثریت میں تھا اور ایراضی اور آمدنی میں مغربی پاکستان کو سبقت حاصل تھی، لیکن مشرقی بنگال کی جبری علیحدگی کے بعد جب پنجاب آبادی کے لحاظ سے باقی تمام صوبوں کی نسبت اکثریت میں آگیا تو 1974ء کے این ایف سی ایوارڈ کے تحت، صوبوں میں مالیاتی تقسیم کی بنیاد پہلے کی طرح ریونیو اور زمین کی بجائے صرف آبادی کو ٹھہرایا گیا، جو کہ 35 سال قائم رہا۔ دنیا کی 27 وفاقی ریاستوں میں ایسا کوئی بھی وفاقی ملک نہیں ہے، جس میں صوبوں/ ریاستوں کے درمیاں مالیاتی تقسیم صرف آبادی یا خصوصاً آبادی کی بنیاد پر ہوتی ہو۔ چھٹے مالیاتی ایوارڈ کے تحت سب سے پہلے 55 فصید حصہ سیدھا وفاق کو جاتا رہا، جس کو Vertical Distribution کہا جاتا ہے اور باقی بچے ہوئے 45 فیصد میں سے پنجاب کو 57.36 فیصد، سندھ کو 23.71 فیصد، بلوچستان کو 5.11 فیصد، جبکہ خیبر پختونخواہ کو 13.82 فیصد دیا گیا۔ جس کو تقسیمی پول (Divisible Pool) کہا جاتا ہے۔ دنیا میں کہیں بھی کسی وفاقی نظام کے تحت وسائل کی ایسی ناجائز تقسیم کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ یعنی دونوں طرف سے اس فارمولا کے تحت ملک کے

مالیاتی ایوارڈ کی صورت میں مالیاتی وسائل کا بڑا حصہ پنجاب لے جاتا رہا۔ جب کہ ملک کی مجموعی مالیاتی آمدنی میں سندھ تقریباً 70 فصید دیتا ہے اور اگر این ایف سی ایوارڈ کا تعین ریونیو کی پیداوار کی بنیاد پر کیا جائے تو پنجاب کا حصہ جا کے 23.06 فیصد ٹھریگا اور سندھ کا حصہ 69.02 فیصد ہوگا۔ نتیجے میں مالیاتی وسائل کی تقسیم پاکستان میں ہمیشہ مرکز، صوبوں اور پنجاب کے درمیان تنازعات کا سبب رہی ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے 10 دسمبر 2009ء کو ملک کے ساتویں این ایف سی ایوارڈ کا اعلان کیا۔ جس کے مطابق مرکز اور صوبوں کے درمیان وسائل کی تقسیم 44%-56% کی شرح کے تحت کی گئی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اب صوبوں کو 45% کی بجائے 56% دیا جارہا ہے اور مرکز 55% کی بجائے 44% حصہ لے رہا ہے۔ جب کہ اُصولاً ہونا یہ چاہیئے تھا کہ یہ شرح 20%-80% رکھی جاتی۔ نئے ایوارڈ کے تحت صوبوں کے درمیان تقسیم اس مرتبہ صرف آبادی کی بجائے بظاہر کثیر معیار بنیاد پر کی گئی، لیکن بدقسمتی سے اس بار بھی صوبوں کے درمیان وسائل کی تقسیم میں 82% حصہ آبادی کی بنیاد پر مختص کیا گیا۔ جب کہ غربت اور پسماندگی کا حصہ صرف 10.3%، ریونیو کی پیداوار اور کلیکشن صرف 5% اور ایراضی کی شرح کا حصہ 2.7% رکھا گیا۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ملکی وسائل کا قطعی بڑا حصہ اب بھی بالادست اور بڑے صوبے پنجاب کو ہی جائے گا۔ (دیکھیں چارٹ نمبر 2) مجموعی طور پر ساتویں این ایف سی ایوارڈ کے تحت پنجاب کو 53.1%، سندھ کو 24.94%، خیبر پختونخواہ کو 14.88% اور بلوچستان کو 7.17% حصہ ملا، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ملک کی مجموعی ریونیو پیداوار میں 69.2% حصہ دینے والا صوبہ سندھ اب بھی محض 24.94% حصہ لے رہا ہے، جس سے سندھ کے احساسِ محرومی میں بدستور اضافہ تو ہو سکتا ہے، لیکن اُس کا سدِ باب دور دور تک نظر نہیں آتا۔

اگرچہ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت ماضی کے مصلحت پسند اور بے انصافی پر مبنی مرکزیت پسند فیصلوں کی طرح اس ایوارڈ کو اپنا جمہوری کارنامہ قرار دیتی ہے، لیکن اُس کے برعکس تلخ حقیقت یہ ہے کہ سوائے بلوچستان کو جزوی فائدہ دینے کے باقی سندھ کو اس ایوارڈ

سے نہ صرف کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا، بلکہ بنیادی طور پر ناجائز مفادات اور بے انصافیوں کا مالیاتی اسٹیٹسکو اس ایوارڈ میں بھی جوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے۔

این ایف سی ایوارڈ کے حوالے سے مندرجہ ذیل باتوں پر عمل درآمد کے سوا صوبائی خود مختاری کے سوال کی اہمیت ایک دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگی۔

- سب سے پہلے وسائل اور آمدنی کی تقسیم کے اس ایوارڈ کو قومی مالیاتی ایوارڈ کی بجائے "وفاقی مالیاتی ایوارڈ" کہا جائے، کیونکہ پاکستان ایک قوم نہیں بلکہ بہت ساری اقوام پر مشتمل ایک الحاق/ وفاق ہے۔
- وفاق اور صوبوں کے درمیاں جو خزانے کی تقسیم ہوتی ہے اور جس کو Vertical Distribution کہا جاتا ہے، اس کو 1997ء سے پہلے والے تناسب سے بحال کیا جائے، جس کے تحت مرکز کو 20 فیصد اور صوبوں کو 80 فیصد دیا جاتا تھا، جب کہ موجودہ وقت میں تقسیم کے تحت مرکز 55 فیصد لے جاتا ہے، جب کہ صوبوں کو 45 فیصد حصہ دیا جاتا ہے، اور نئے ایوارڈ کے تحت وفاق کو 44 فیصد اور صوبوں کو 56 فیصد دیا جائے گا۔ جو کہ چھوٹے صوبوں اور خصوصاً سندھ کے سراسر معاشی استحصال کے مترادف ہے۔
- موجودہ دستور کے آرٹیکل 160 (ڈی) کے مطابق مرکز کو صوبوں کے درمیاں وسائل کی تقسیم میں کوئی بھی مداخلت نہیں کرنی۔ اس لئے صوبوں کے درمیاں تقسیم یعنی Horizental Distribution کو این ایف سی ایوارڈ میں شامل نہیں کیا جانا چاہیئے۔ یہ استحقاق صوبوں کا ہے کہ وہ یہ معاملات آپس میں جمہوری انداز میں طے کریں۔ جب کہ یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب مرکز میں صوبوں کے ٹیکسز اور آمدنی کے جدا جدا اکائونٹ رکھے جائیں، جس میں مرکز اپنے 20 فیصد حصے کی کٹوتی کے بعد صوبوں کے تمام مالیاتی وسائل اور آمدنی متعلقہ صوبوں کو اپنے اپنے اکائونٹس کے ذریعے واپس کردے۔

- صوبوں کے درمیاں خزانے کی تقسیم اتفاق رائے سے نہیں بلکہ عالمی اُصولوں، انصاف پسند جمہوری روایات اور اکثریتی رائے کے تحت کی جائے۔ کیونکہ اتفاقِ رائے کا مطلب ویٹو پاور ہے، جو کہ عملی طور پر ایک بالادست صوبے/ قوم کی اجارہ داری کو فیصلہ کن قوت بخشتا ہے، متضاد مفادات کی ایسی پیچیدہ صورتحال میں کوئی بھی فیصلہ اکثریتی رائے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ جب پانی اور صوبائی خود مختاری کا تنازعہ اتفاق رائے سے حل نہیں کیا جاتا تو اتفاقِ رائے کا اطلاق صرف این ایف سی ایوارڈ پر ہی کیوں ہوتا ہے؟
- صوبوں کے درمیاں خزانے کی تقسیم آبادی کی بجائے کثیر المعیار فارمولے کے تحت کی جائے، جس میں بنیادی اہمیت آبادی کی کے ساتھ ساتھ ریونیو اور غربت کو دی جائے۔ جب کہ ساتویں مالیاتی ایوارڈ میں بھی 82 فیصد حصہ آبادی کی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔
- جنرل سیلز ٹیکس کو مکمل اور عملی طور پر صوبوں کے اختیار اور تحویل میں دیا جائے۔ دستور کے آرٹیکل 142 میں بھی یہ ہی کہا گیا ہے۔
- صوبوں کے کسی بھی ٹیکس کو وفاقی مالیاتی ایوارڈ کی TORs میں شامل نہ کیا جائے۔
- گئس ڈولپمینٹ سرچارج کا اُصولی طور پر مالیاتی ایوارڈ سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے اور نہ ہونا چاہیئے۔ صدر کو صرف وہ ٹیکس شامل کرنے کا اختیار ہے جو کہ مرکز اور صوبوں کے درمیاں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ جب کہ حقیقت میں جی ڈی ایس (GDS) ٹیکس نہیں بلکہ ایک قسم کی فی ہے۔ اس لئے یہ مکمل طور پر صوبائی معاملہ ہونا چاہیئے اور اس کو مالیاتی ایوارڈ میں شامل کرنے کی کوشش نہ صرف غیر آئینی ہے بلکہ صوبائی خود مختاری کی روح کے ہی خلاف ہے۔
- پرویز مشرف کی وفاقی حکومت نے تیل پر ڈیوٹی کو بھی این ایف سی کا حصہ بنانے کی کوشش کی، جب کہ دستور کے مطابق اس حوالے سے کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار

صرف "کائونسل آف کامن انٹریسٹ" کو ہے،اس لئے وفاقی حکومت کوایسا کوئی بھی اختیار نہیں ہے،یوں تیل پر ڈیوٹی کواین ایف سی ایوارڈ کا حصہ نہ بنایاجائے۔

چارٹ۔1:

مختلف این ایف سی ایوارڈز کے تحت وسائل کی بین الصوبائی تقسیم						
	(فیصد)					
سال	وفاقی/ صوبائی	پنجاب	سندھ	خیبر پختونخواہ	بلوچستان	کل
1974	20.80	60.25	22.50	13.39	3.86	100
1979	20.80	57.97	23.34	13.39	5.30	100
1985	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ
1990	20.80	57.87	23.29	13.54	5.30	100
1996	62.5:37.5	57.88	23.28	13.54	5.30	100
2000 (نہیں دیاگیا)	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ	عبوری ایوارڈ
2006 (تخمینہ)	45.55 *	56.07	25.67	13.14	5.13	100

* صوبائی حصہ 50 فیصد تک لانے کے لئے ہر سال ایک فیصد بڑھانے کا وعدہ کیا گیا

- PIDE working papers 2007: 33, Islamabad.

چارٹ۔2:

ساتویں قومی مالیاتی ایوارڈ کے تحت وسائل کی تقسیم					
وفاق اور صوبوں کے درمیان تقسیم					
وفاق	2010-11ع	2010-15ء	صوبے	2010-11ء	2010-15ء
	57.50فیصد	56فیصد		42.50	44فیصد

	فیصد				
صوبوں کے درمیان تقسیم					
صوبہ		ساتواں مالیاتی ایوارڈ		چھٹہ مالیاتی ایوارڈ	
پنجاب		51.74فیصد		53.1 فیصد	
سندھ		24.55فیصد		24.94فیصد	
پختون خواہ		14.62فیصد		14.88فیصد	
بلوچستان		9.09فیصد		7.17فیصد	
کثیر معیار تقسیم کی شرح					
آبادی			82فیصد		
غربت/ پسماندگی			10.3فیصد		
آمدنی			5.0فیصد		
ایراضی			2.7فیصد		

چارٹ·3:

قومی مالیاتی ایوارڈ کے صوبوں کے درمیاں تقسیم کے موجودہ اور دیگر تجویز کردہ فارمولے				
صوبہ	آبادی	غربت اور پسماندگی	رونیو کلیکشن	زمین/ جغرافیائی چوڑائی
	(فیصد)			
پنجاب	57.36	20.6	23.04	4.32
سندھ	23.71	22.5	69.02	7.18
بلوچستان	5.11	24.9	2.40	82.0
خیبر پختونخواہ	13.82	32.0	5.54	6.5

Source: Jami Chandio, "Crisis of Federalism and Prospects for Provincial Autonomy in Pakistan", 2009, Chapter 3.

چارٹ۔4:

وفاقی/ صوبائی ریونیو پروفائیل				
سال	وفاقی ٹیکس ریونیو	صوبائی ٹیکس ریونیو	وفاقی نان ٹیکس ریونیو	صوبائی نان ٹیکس ریونیو
1980	31503	1809	4731	559
1985	57921	3297	15184	1001
1990	114004	5431	38182	1188
1995	248059	9833	51395	8645
2000	386800	18800	90800	16100
2005	34611	34611	218271	22404
2006	42800	42800	247200	42800

Source: Economic Survey (various issues)

قدرتی وسائل کا استحصال اور قومی/ صوبائی خود مختاری:

زیرِ زمین یا زیرِ آب قدرتی وسائل لاکھوں، کروڑوں سالوں کے مختلف اور پیچیدہ فطری مراحل سے گذرنے کے بعد وجود میں آتے ہیں، اور دنیا میں جہاں بھی وہ پائے جاتے ہیں، ان کو وہاں بسنے والی قوموں اور افراد کے لئے خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا ہے، لیکن جدید نوآبادیاتی نظام میں یہ قدرتی وسائل اپنی مالک قوموں اور عوام کے لئے بد بختی، لوٹ مار اور معاشی نسل کشی کی علامت بن گئے ہیں۔ پاکستان میں چھوٹی قومیں اور خصوصاً سندھی اور بلوچ عوام پچھلی سات دہائیوں سے اپنے قدرتی وسائل کی وجہ سے بدترین معاشی لوٹ مار کا شکار ہوئے ہیں اور یہ لوٹ مار گذشتہ چھ دھائیوں سے جاری ہے۔ جس میں دن بدن اضافہ تو ہو رہا ہے لیکن اس کے سدباب کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ مثلاً سندھ پاکستان کی مجموعی گیس کی پیداوار کا 68.65 فیصد پیدا کرتا ہے جبکہ بلوچستان کی ملکی گیس کی پیداوار میں حصیداری 18.37

فیصد ہے۔ تیل کی پیداوار میں بھی سندھ کی شراکت 40.63 فیصد ہے، جبکہ خیبر پختونخواہ صوبہ 40.4 فیصد، پنجاب 18.90 فیصد اور بلوچستان 0.07 فیصد تیل پیدا کرتے ہیں۔ ملک میں کوئلے میں بھی سندھ کا حصہ تمام صوبوں سے زیادہ ہے، یعنی 88.7 فیصد ہے، جبکہ وفاق جو کہ دراصل پنجاب کے حکمران طبقے کے ناجائز سیاسی اور معاشی مفادات کا علمبردار اور محافظ ہے، وہ 2010ع میں اٹھارویں آئینی ترمیم آنے سے پہلے تک قدرتی وسائل کی رائلٹی کا 88.5 فیصد اوپر سے ہی لے جاتا رہا اور صوبوں کو صرف 12.5 فیصد حصہ ملتا رہا جو بھی افسر شاہی اور حکومتوں کی کرپشن کا نوالہ بن جاتا ہے اور اس میں سے تیل، گیس اور کوئلہ پیدا کرنے والے اضلاع اور صوبوں خصوصاً سندھ اور بلوچستان کے مظلوم عوام کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ اس کی ایک واضح مثال بدین ضلع ہے، جو کہ ملک میں تیل کی پیداوار میں سب سے آگے ہے، لیکن ترقی کے حوالے سے سب سے بدتر حالت میں ہے۔ یو این ڈی پی (UNDP) کی انسانی ترقی کے حوالے سے 2003ء کی رپورٹ میں پاکستان کے 91 (پاکستان میں 109 اضلاع ہیں) اضلاع میں سے بدین کا 60 وان نمبر ہے۔ قدرتی وسائل کے شعبوں میں کام کرنے والی کمپنیوں میں بھی سندھیوں اور بلوچوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ یعنی جو صوبہ روزانہ 31583 بیرل تیل اور 2871650000 کیوبک فٹ گیس پیدا کرتا ہے اور جس کا ملک کی ریونیو کی پیداوار میں حصہ 70 فیصد ہے، اس کی معاشی حالت یہ ہے کہ اس کی 37 فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرتی ہے۔ اس کے 70 فیصد گاؤں کے لوگ بے زمین کسان یا زرعی مزدور ہیں۔

کم و بیش وہ ہی حالت بلوچستان، پنجاب کے سرائیکی خطے اور خیبر پختونخواہ کے اکثریتی علاقوں کی ہے۔ جہاں بیشمار قدرتی وسائل ہونے کے باوجود اصل باشندے خستہ حال، دربدر اور زندگی کی بنیادی سہولیات و ذرائع سے محروم ہیں، اس صورتحال میں تب تک تبدیلی ممکن نہیں ہے، جب تک قدرتی وسائل پر مکمل اختیار صوبوں اور تاریخی طور پر ان کے مقامی لوگوں کو نہیں دیا جاتا۔

چارٹ 5:

ملک میں قدرتی وسائل کی تقسیم اور رائلٹی کا چارٹ		
صوبہ	گیس پیداوار (فیصد)	تیل کی پیداوار (فیصد)
سندھ	56	40.63
پنجاب	*3	18.90
خیبر پختونخواہ	12	40.4
بلوچستان	13	0.07
• رائلٹی میں وفاق اور صوبوں کا حصہ: وفاق: 88.5 فیصد، صوبے: 12.5 فیصد		

Source: www.ogra.org.pk/download/3267

چارٹ 6:

سندھ کے تیل اور گیس کے وسائل			
	گیس (ملین CFT)	تیل (ملین بیرل)	کوئلہ (ملین ٹن)
ملکی پیداوار	1,505,841	27.84	4.87
سندھ کی پیداوار	1,033,794	11.37	2.01
سندھ کا حصہ (فیصد)	68.65	40.63	41

Source: Pakistan Energy Year Book – 2013
Memon, Naseer, "Oil & Gas Resources and Rights of Provinces." Agusts 2014.

چارٹ 7:

*پنجاب کا 16 فیصد حصہ آر ایل این جی کی صورت میں ملکی پیداوار میں شامل ہے۔

صوبوں کی سالانہ گیس پیداوار اور استعمال 2013			
صوبہ	کل گیس پیداوار (MMCF)	زیرِ استعمال گیس (MMCF)	ریشو (استعمال بمقابلہ پیداوار فیصد)
سندھ	1,033,794	576,519	55
پنجاب	69,220	542,185	783
سرحد	126,234	65,179	51
بلوچستان	276,593	84,097	30

Source: Pakistan Energy Year Book – 2013
Memon, Naseer, "Oil & Gas Resources and Rights of Provinces." Agusts 2014.

وفاقی بیوروکریسی اور چھوٹے صوبوں کے مقامی لوگوں کی نمائندگی:

جس طرح پاکستان میں کبھی بھی آمریتی یا منتخب حکومتوں میں تمام صوبوں اور ان میں بسنے والی تاریخی قوموں کا نمائندہ وفاق موجود نہیں رہا۔ اسی طرح پاکستان کے کسی بھی ادارے کو صحیح معنوں میں وفاقی ادارہ نہیں کہا جا سکتا۔ بیوروکریسی کسی بھی ملک میں اس ملک کے ریاستی ڈھانچے، پاور اسٹرکچر، طاقت کے توازن اور مجموعی حساب سے ریاست پر قابض قوتوں کے مفادات کی آئینہ دار ہوتی ہے، اس لئے ہی بیوروکریسی کو پوری دنیا میں ریاست کا انتظامی ہتھیار بھی کہا جاتا ہے۔ پاکستان کی بیوروکریسی بھی جیسا کہ مجموعی طور پر اسٹبلشمنٹ کا حصہ ہے، اس لئے وہاں بھی پاکستان کے قیام سے پنجابی-اردو حکمران ٹولہ حاوی ہے، جس کی ویسے بھی ملک کی ملٹری اور سول اسٹبلشمنٹ میں اجارہ داری رہی ہے۔ پاکستان میں ملٹری اور سول بیوروکریسی میں پنجاب اور پنجابیوں کی اکثریت رہی ہے، جس میں دوسرے نمبر پر اردو بولنے والے حکمران طبقات ان کے حصیدار رہے ہیں۔ باقی سندھیوں، سرائیکیوں اور بلوچوں کا مجموعی طور پر ملک کی بیوروکریسی میں تو کوئی خاطر خواہ حصہ یا نمائندگی نہیں ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب

نہیں کہ ہم پنجابی یا اردو بولنے والے بھائیوں کے جائز حقوق یا ان کی مجموعی ترقی کے خلاف ہیں، لیکن سوال تمام شہریوں اور قوموں کے ساتھ انصاف اور جائز نمائندگی کا ہے۔ (ملاحظہ کیجئے چارٹ نمبر 10)

ملک کے وفاقی ادارے ملک پر قابض پنجابی اور اردو بولنے والے حکمران طبقات کے ناجائز مفادات کے آئینہ دار رہے ہیں۔ مثلاً ملک کی بری، بحری اور فضائی فوج کے ادارے، ملک کے چاروں صوبوں اور ان میں بسنے والی تاریخی قوموں کے نمائندہ نہیں ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان کی فوج میں پنجاب (پنجابی بولنے والوں) کا حصہ 79 فیصد ہے، گرچہ مشرقی پاکستان یعنی بنگال ملک کی مجموعی آبادی کا 56 فیصد تھا، لیکن اس کے باوجود نہ صرف ان کی زبان اور قومی تشخص کو نظرانداز کیا گیا بلکہ ان کو فوج کے ساتھ تمام وفاقی اداروں میں نمائندگی برائے نام بھی نہیں دی گئی۔ یہ سراسر غلط ہے کہ مشرقی بنگال خود ملک سے الگ ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو عملی طور پر دھکیل کر ملک سے الگ کیا گیا تھا۔ کیونکہ اکثریتی آبادی کی وجہ سے مشرقی پاکستان یعنی بنگال پنجابی-اردو بولنے والے حکمران طبقات کے لئے ایک مستقل خطرہ تھا۔ (دیکھیں چارٹ نمبر 12-13)

ملک کی وفاقی بیوروکریسی میں قوموں کی نمائندگی پر نظر ڈالیں تو تعجب اور افسوس ہوتا ہے، یعنی 1973ء تک ملک کی وفاقی بیوروکریسی میں پنجابی 49.3 فیصد تھے، پشتون 10.5 فیصد، سندھی صرف 3.1 فیصد، اردو بولنے والے 30.1 فیصد، فاٹا 2.6 فیصد اور آزاد جموں کشمیر 1.8 فیصد تھے۔ جب کہ بھٹو صاحب کے دوٗر سے لیکر 1983ء تک کا تناسب اس طرح سے تھا۔ پنجابی 54.9 فیصد، پشتون 13.4 فیصد، سندھی 5.4 فیصد، اردو بولنے والے 17.4 فیصد، فاٹا 3.6 فیصد اور آزاد جموں کشمیر 1.9 فیصد۔ اس طرح 1986ء تک کا تناسب کچھ اس طرح سے تھا۔ پنجاب 55.3 فیصد، پشتون 12.6 فیصد، سندھ 7.2 فیصد، اردو بولنے والے 18.2 فیصد، فاٹا 1.4 فیصد اور آزاد جموں کشمیر 1.7 فیصد تھے۔ 1986ء کے بعد بھی اس صورتحال میں بہتری آنے کی بجائے صورتحال بتدریج خراب ہوتی چلی گئی۔ خصوصاً پرویز مشرف کے 9 سالوں میں بھی پنجاب اور ایم کیو ایم/ اردو بولنے والے حکمران طبقات کو ملک

کے تمام شعبوں میں Space دیا گیا لیکن خصوصاً سندھیوں اور بلوچوں کو بالکل دیوار سے لگا دیا گیا۔ صوبائی بیوروکریسی میں بھی صورتحال کچھ زیادہ مختلف نہیں رہی۔ مثلاً صرف یہ دیکھا جائے کہ صوبہ سندھ میں گذشتہ چھ دھائیوں سے سندھ کا چیف سیکریٹری اور آئی جی پولیس کتنی مرتبہ کوئی سندھی رہا ہے؟ اگر پاکستان میں سیاہ و سفید کی مالک ملٹری اور سول بیوروکریسی رہتی ہے اور صوبوں میں تاریخی مقیسنوں اور دھرتی کے مالکوں کی جگہ بیوروکریسی اور انتظامی مشینری پر غیر مقامی لوگ قابض ہونگے تو صوبائی خود مختاری مظلوم قوموں کے ساتھ ایک مزید دھوکے کے علاوہ کوئی معنے نہیں رکھتی۔[9]

صوبوں میں بسنے والی دوسری ثقافتی اور لسانی اقلیتوں کے جائز سیاسی، معاشی، ثقافتی اور لسانی حقوق کی پاسداری بھی اشد ضروری ہے، لیکن ان کی اجارہ داری یا مراعتیافتہ حیثیت سے مزید تضاد تو بڑھ سکتے ہیں، لیکن باہمی محبت کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہم یہ بالکل نہیں کہتے یا سمجھتے کہ سندھ میں اردو بولنے والے بھائیوں کو آبادی کے اعتبار سے جائز حق نہیں ملنا چاہیئے، لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ سندھیوں کو زندگی کے ہر میدان میں دیوار سے لگایا جائے اور سندھیوں کو سندھ پر ان کے تاریخی حقِ حکمرانی سے عملاً محروم کر دیا جائے۔

چارٹ 11:

وفاقی افسر شاہی میں قوموں اور نسلی گروہوں کی نمائندگی کا تناسب			
	1973	1983	1986
پنجابی	49.3فیصد	54.9فیصد	55.3فیصد
پشتون	10.5فیصد	13.14 فیصد	12.6فیصد
سندھی	3.1فیصد	5.4فیصد	7.2فیصد

[9] Jami Chandio, "Crisis of Federalism and Prospects for Provincial Autonomy in Pakistan" 2009, p. 186.

اردو بولنے والے۔	30.1فیصد	17.4فیصد	18.2فیصد
فاٹا	2.6فیصد	3.6فیصد	1.4فیصد
آزاد کشمیر	1.8فیصد	1.9فیصد	1.7فیصد

Source: Charles H. Kennedy, "Managing Ethnic Conflict: The Case of Pakistan", Regional Politics and Policy (Spring 1993): p. 138.

چارٹ۔12:

پاکستانی فوجی افسر شاہی– 1955 (پہلی دہائی)		
	مشرقی پاکستان/ مشرقی بنگال	مغربی پاکستان
لیفٹیننٹ۔جنرل	0	3
میجر جنرل	0	20
بریگیڈیئر	1	34
کرنل	1	49
لیفٹیننٹ کرنل	2	198
میجر	10	590
نیوی آفیسر	7	593
ایئر فورس آفیسر	40	640

Source: Dawn, 9 January 1956, Cited in Mizanar Rehman, 'The Emergence of Bangladesh as a Sovereign State,' Ph.D thesis, Institute of Commonwealth Studies, 1975, p. 67.

چارٹ13:

مرکزی سیکریٹریٹ میں اعلیٰ افسر شاہی، 1955 (پہلی دہائی)		
	مشرقی پاکستان/ مشرقی بنگال	مغربی پاکستان
سیکریٹری	0	19
جوائنٹ سیکریٹری	3	38
ڈپٹی سیکریٹری	10	123
انڈر سیکریٹری	38	510

Source: Pakistan Constituent Assembly Debates, vol. 1, 7 January 1956, Cited in Minazar Rehman, 'The Emergence of Bangladesh as a Sovereign State,' p. 68.

پانی کا تنازعہ اور قومی/ صوبائی خود مختاری:

پانی کی تقسیم اس ملک کے اندر صوبوں خصوصاً سندھ اور پنجاب کے مابین ایک بڑے اور لامتناہی تنازعہ کا محرک اور سبب بن چکی ہے۔ جس نے وفاق کے باقی بچے ہوئے کمزور وجود اور لرزاں جواز کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔ حقیقت میں سندھ اور پنجاب کا پانی کی تقسیم پر تنازعہ آج کا نہیں ہے۔ یہ برِ صغیر میں انگریز حکومت یعنی 1859ء سے چلتا آرہا ہے اور اس کا آغاز تب ہوا، جب مشترکہ پنجاب نے ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے دوران دریائے سندھ پر ناجائز طور پر ڈیم اور آبپاشی کے متنازعہ منصوبے تعمیر کرنا شروع کیے۔ یوں بھی پانی کی تقسیم پوری دنیا میں ایک بڑا حساس معاملہ رہا ہے۔ اس لئے اس کے قوانین بھی عالمی سطح پر بڑے سخت ہوتے ہیں۔ دنیا کا یہ تسلیم شدہ عالمی اُصول ہے کہ دریاؤں پر آخری اور فیصلہ کن حق نچلے فریق (Lower Riparian) کا ہوتا ہے اور ان کی مرضی اور قانونی اجازت یا رضامندی و معاہدے کے بغیر اوپر والے حصیدار (Upper Riparian) کو دریا پر ڈیم تعمیر کرنے، پانی چُرانے یا کوئی بھی آبپاشی کا منصوبہ بنانے کا اختیار نہیں ہوتا۔ لیکن پنجاب برطانوی دوَر سے لیکر آج تک اس عالمی اُصول کی مسلسل انحرافی کرتا آیا ہے۔ تاریخ کی ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ پنجاب اپنے سیاسی کردار کی وجہ سے انگریز سامراج کا منظور نظر صوبہ بنا ہوا تھا، کیونکہ پنجاب نے ہمیشہ انگریزوں کا

ہی ساتھ دیا تھا۔ جبکہ سندھ اس کے مقابلے میں ایک نظر انداز کیا ہوا اور دیوار سے لگا ہوا علاقہ تھا، جس کو انگریزوں نے بمبئی سے ملا کر محض ایک ڈویژن تک محدود کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود آج کے پاکستان کی نسبت سندھ کو انگریز سرکار میں پھر بھی پانی کا جائز حصہ ملتا رہا اور سندھ انڈس بیسن دریاؤں یعنی سندھو، جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج کے پانی میں نچلے فریق (Lower Riparian) کی حیثیت میں حصیدار تھی۔ لیکن پنجاب کے حکام نے برطانوی سرکار میں اپنی مراعت یافتہ حیثیت کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے انڈس بیسن دریاؤں پر ناجائز طور پر ڈیم اور کنال تعمیر کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جس کا ثبوت 1855ء سے 1901ء کے درمیان تعمیر شدہ سرہند کنال، لوئر پنجاب کنال اور لوئر جہلم کنال ہیں۔ اس طرح 1908ء میں بہاڑپور کنال اور 1917ء میں اپر سوات کنال تعمیر کئے گئے۔ جو کہ سراسر ناجائز اور غیر قانونی تھے۔ 1915ء میں پنجاب کے حکام نے سہ-کنالی منصوبہ شروع کیا۔ جس کے تحت ناجائز طور پر جہلم کنال، چناب کنال اور لوئر باری کنال تعمیر کئے گئے، لیکن پنجاب کی طرف سے مشترکہ حقوق کے احترام کی تمام حدود پار کرتے ہوئے 1919ء میں جب ستلج ویلی منصوبے کی غیر قانونی تعمیر شروع کی گئی، جس میں گیارہ کنال اور چار دیگر آبپاشی منصوبے شامل تھے، تب جاکر برطانوی سرکار نے بھی اس کا نوٹس لیا اور اس طرح یہ معاملہ مرکزی سرکار کی جانب گیا اور انگیز سرکار کی جانب سے "کاٹن کمیشن" کا قیام عمل میں آیا اور اس کمیٹی نے پنجاب کے اس فیصلے کو یہ کہتے ہوئے رد کیا کہ پنجاب آخر والے نچلے فریق یعنی سندھ کی مرضی کے بغیر انڈس بیسن دریاؤں پر کوئی بند یا کنال تعمیر نہیں کر سکتا۔ جب پنجاب کی طرف سے یہ حق تلفی اور مشترکہ حقوق کی انحرافی بند نہ ہوئی تو 1935ء میں ایک مرتبہ پھر انگریز سرکار کی طرف سے "اینڈرسن کمیٹی" بنائی گئی، جس میں پنجاب کا یہ اعتراض بھی شامل کیا گیا کہ سندھ کو سکھر بئراج تعمیر کرنے کا کوئی بھی اختیار نہیں ہے۔ کمیٹی نے 30 مارچ 1935ء کو اپنی رپورٹ جاری کی لیکن اس رپورٹ کی بنیاد پر حکومت کی طرف سے حتمی رپورٹ 30 مارچ 1937ء کو جاری کی گئی اور فیصلہ سنایا گیا۔ پنجاب نے ایک دن کے لئے بھی خاموشی اختیار نہیں کی اور اس نے اپنے ناجائز اور غیر قانونی آبپاشی کے منصوبے بنانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

پاکستان کے حکمرانوں کی نسبت انگریز سامراج کی حکومت بھی ایک حد تک انصاف پسند تھی، جس نے پنجاب کی مراعت یافتہ حیثیت کے باوجود ہمیشہ پانی کی انصاف پسند تقسیم پر زور دیا اور پنجاب کو اس معاہدے کا پاس رکھنے کا پابند رکھنے کی کوشش کی۔ جس کی مثال 1945ء کا سندھ طاس معاہدہ ہے۔ یہ معاہدہ کلکتہ ہائی کورٹ کے اُس وقت کے چیف جسٹس رائے (جس کے نام سے رائے کمیشن قائم ہوئی) کی قیادت میں کیا گیا، جس کو ہندوستان کی مرکزی سرکار کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا۔ کیونکہ سندھ نے ایک بار پھر 1939ء میں انگریز حکومت کے آگے اعتراض درج کروایا تھا کہ بکھر اڈیم کے نام پر پنجاب سندھ کا پانی چوری کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ رائے کمیشن نے واضح طور پر پنجاب کے اس موقف کو مکمل طور پر رد کیا کہ پنجاب کو مشترکہ پانی پر آخر والے نچلے فریق یعنی سندھ کی مرضی کے بغیر کوئی منصوبہ بنانے کا اختیار ہے۔ رائے کمیشن کی سفارشات اور فیصلوں کے نتیجے میں 1945ء میں سندھ-طاس پانی معاہدہ عمل میں آیا، جس پر سندھ اور پنجاب کی اختیاریوں اور متعلقہ حکام نے دستخط کئے لیکن المیہ یہ ہے کہ پنجاب نے اس کے بعد بھی اپنے پانی کی لوٹ مار کے سلسلہ کو نہیں روکا اور پنجاب نے مختلف منصوبوں کی صورت میں یہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ جاری رکھا۔

پاکستان بننے کے بعد جب پاکستان کی طرف سے بھارت کے ہاتھ "انڈس بیسن ٹریٹی" کے نام پر معاہدہ کیا گیا تو اُس وقت ملک میں ون یونٹ نافذ تھا اور ان دنوں سندھ سے قومی تو کیا صوبائی حیثیت بھی چھین لی گئی تھی اور سندھ کو ان نام نہاد معاہدوں کے تمام مراحل اور معاملات میں شامل نہیں کیا گیا اور پنجاب نے مرکز کی شکل میں پر مشترکہ پانی کے تین دریا بھارت کو بیچ دیئے، جن پر انگریز دؤر سے لیکر سندھ کا قانونی حق تسلیم کیا گیا تھا۔ تربیلا اور منگلا ڈیم کے وقت بھی یہ ہی ہوا اور نہ صرف سندھ کو اس میں سے مطلوبہ حصہ کبھی نہیں ملا بلکہ سندھ کی زراعت، سمندر کے اندر تمر کے قیمتی اور نایاب جنگلات (Mangrove Forests) اور دریا پر منحصر ساری حیات کو بہت بڑا نقصان ہوا۔

> "پانی کا تنازعہ سندھ اور پنجاب کے درمیان بہت پرانا ہے۔ اس کی سادہ مثال یہ ہے کہ اس وقت تک اس حوالے سے چھ کمیشن بن چکے ہیں، جن میں یہ

تنازعہ حل کرنے کے لئے سفارشات ترتیب دی گئیں، لیکن تنازعہ اپنی جگہ پر آج تک نہ صرف جوں کا توں موجود ہے، بلکہ دن بدن بڑھتا ہوا تیز ہو رہا ہے۔ 1935ء میں "اینڈرسن کمیشن" بنائی گئی۔ 1941ء میں "انڈس راؤ کمیشن" بنی، 1968ء میں "اختر حسین کمیشن" بنائی گئی، 1970ء میں "فضل اکبر کمیشن" ترتیب دی گئی، 1981ء میں "حلیماں کمیشن" بنی، لیکن پاکستان میں صوبوں خصوصاً سندھ اور پنجاب کے درمیان پانی کا تنازعہ حل نہ ہو سکا۔ 1991ء میں پانی معاہدہ کے نتیجے میں انڈس ریور سسٹم اتھارٹی یعنی "ارسا" کا قیام بھی اسی وجہ سے عمل میں لایا گیا کہ یہ اتھارٹی پانی معاہدی کے مطابق پانی کی صحیح تقسیم کو یقینی بنا کر تنازعہ کو حل کرنے میں کردار ادا کرے گی لیکن اس کے برعکس نہ صرف پانی کی تقسیم انصاف کے تقاضائون پر نہ اُتر سکی بلکہ واپڈا کی طرح وہ بھی پنجاب حکومت کے ہاتھوں میں کھیلتی رہی اور بدستور کھیل رہی ہے۔"[10]

"خود 1991ء کا پانی معاہدہ بھی جام صادق کی غیر نمائندہ حکومت کی معرفت سندھ پر زبردستی مسلط کیا گیا تھا۔ سندھ کے ماہرین، عوام اور سیاسی پارٹیوں نے اُس وقت بھی اس معاہدے کی سخت مخالفت کی تھی۔ اس کا پورا رکارڈ آج بھی موجود ہے، لیکن آج پنجاب حکومت اور وفاق اس پر بھی عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مثلاً 1991ء کے پانی معاہدے کے مطابق جب تک کوٹڑی ڈائون اسٹریم کے نیچے پانی کی لازمی رسائی کا معاملہ طے نہیں ہوتا، تب تک پانی کی تقسیم کے حوالے سے کوئی بھی منصوبہ انڈس پر نہیں بنایا جاسکتا، لیکن اس کے باوجود ایک طرف 1991ء سے لیکر معاہدے کے مطابق ڈائون اسٹریم کوٹڑی کے نیچے پانی چھوڑنے کے حوالے سے کوئی بھی اسٹڈی نہیں کروائی گئی اور نہ ہی طے شدہ پانی دیا گیا ہے، جس کی کوئی بھی قانونی

---

[10] جامی چانڈیو: "تبدیلیءجامحر °° سہ۔ جوآئیندو"، ترتیب: منیر چانڈیو، سینٹر فار پیس اینڈ سول سوسائٹی حیدرآباد، 2007ء، ص: 107-106۔

حیثیت نہیں ہے۔ نتیجے میں ڈائون اسٹریم کوٹڑی کے نیچے پانی نہ دینے کی وجہ سے سمندر کے اُبھار سے سندھ کے دو اضلاع بدین اور ٹھٹہ بڑی حد تک متاثر اور تباہ ہو گئے ہیں۔ لاکھوں ایکڑ زرعی زمین نمکین ہونے کی وجہ سے نہ صرف قابل کاشت نہیں رہی بلکہ ماحولیاتی تباہی کا سبب بن گئی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ڈائون اسٹریم کوٹڑی کے نیچے پانی نہ دینے کی وجہ سے سندھ کی 19 لاکھ ایکڑ زمین پر مشتمل دریائی زمین بھی تباہ ہو گئی ہے۔ خود انڈس ڈیلٹا میں جو تمر کے جنگلات ہیں، وہ مسلسل بری طرح تباہ ہو رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کے تمر کے بڑے جنگلات میں چھٹے نمبر پر ہیں، جو کہ 650،000 ایکڑوں پر مشتمل ہیں۔ 1991ء میں IUCN نے اس ضمن میں ایک رپورٹ شایع کی تھی، کہ انڈس ڈیلٹا کا محفوظ رہنا اور بڑھنا سندھ کی ماحولیات، معیشت اور ترقی کے لئے بیحد ضروری ہے۔ گذشتہ 10 برسوں سے کوٹڑی ڈائون اسٹریم کے نیچے پانی نہ جانے کی وجہ سے وہ جنگلات مسلسل تباہ ہو رہے ہیں، اور صورتحال بدستور یوں ہی رہی تو کچھ برسوں میں دنیا کا یہ چھٹہ نمبر قدیم ڈیلٹا مکمل طور پر تباہ ہو جائیگا۔ جس کا بڑا حصہ پہلے ہی پانی کی کمی، سمندر کی توسیع اور سمندر کی طرف میٹھے پانی کی رسد بند ہونے کی وجہ سے تباہ ہو چکا ہے۔ دریائے سندھ کے دونوں اطراف سے کچے کی (دریائی زمین) سراسری طور پر 19 لاکھ ایکڑ ہے، جس میں سے چھ لاکھ ایکڑ گھنے جنگلات پر مشتمل رہی ہے، جبکہ باقی حصہ بہت زرخیز زمین اور چراگاہوں پر مبنی رہا ہے اور وہ بھی اب تیزی سے تباہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ان زمینوں، جنگلات اور چراگاہوں کی زندگی کا انحصار دریائے سندھ میں سیلاب پر رہا ہے۔ جتنا پانی کم آئیگا اتنا ہی وہ علاقے سال کے تین مہینے یعنی جولائی، اگست اور ستمبر میں پانی کے نیچے ہونگے۔ ان کو وہ قدرتی نمی اور طاقت میسر نہ ہو گی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سبزیوں، دالوں، لکڑی اور مال مویشی کے حوالے سے بھی یہ عناصر بہت بڑی معاشی قوت رکھتے ہیں اور کم و بیش 13 لاکھ لوگوں کا ذریعہ معاش ہیں۔ آگے چل کر سندھ ساگر کا یہ پانی جہاں بحرِ عرب میں پڑتا ہے، وہاں چھ لاکھ پچاس ہزار ایکڑ کے گھنے سمندری تمر کے جنگلات ہیں، جو اب کہا جاتا ہے کہ سکڑ کر ایک لاکھ تک رہ گئے ہیں۔ ان جنگلات کی معاشی اور ماحولیاتی قدر و قیمت بہت بڑی ہے، جو کہ مچھلی، جھینگوں اور پلے کی نرسری ہے۔ اس کے علاوہ سندھ کے جنوب

کے عام جانور خصوصاً اونٹ کی سب سے بڑی چراگاہ بھی ہے اور وہاں کے لوگوں کے لئے جلانے والی لکڑی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی ہے۔ اس پورے علاقے میں تقریباً 20 لاکھ افراد کا ذریعہ معاش سمندری اور میٹھے پانی کی مچھلی، لکڑی، مال مویشی ہے اور اب وہ تمام نایاب وسائل پانی کی عدم دستیابی اور لوٹ مار کی وجہ سے تباہ ہو رہے ہیں۔"[11]

پانی کا تنازعہ ملکی وفاق کے لئے مستقل خطرہ اور سندھ کے لئے زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔ ملک میں ایوب خان کی حکومت ہو یا شہید بھٹو کی، ضیاالحق کی ہو یا نواز شریف کی، پرویز مشرف کی ہو یا پیپلز پارٹی کی، لیکن کوئی بھی حکومت ملک میں ابھی تک پانی کی تقسیم کا فیصلہ عالمی قوانین اور انصاف کے بنیادوں پر نہیں کر سکی اور نہ ہی موجودہ ریاستی ڈھانچے اور طاقت کے توازن میں شاید کر سکتی ہے۔ کیونکہ ملک کے اصل اختیار و اقتدار کے مالک حکمران طبقہ اور اسٹبلشمنٹ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ آمر پرویز مشرف کے دوٗر میں غیر قانونی طور پر گریٹر تھل کنال تعمیر کیا گیا۔ اور واپڈا کے ویژن 2025ء کے مطابق آبپاشی کے وہ تمام منصوبے رواں ہیں اور دوسروں کے لئے تیاریاں ہو رہی ہیں، جن کو فیصلہ کن فریق کی حیثیت سے سندھ مسلسل رد کر چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس نام نہاد صوبائی خودمختاری میں سندھ کو اپنے پانی کا جائز حصہ نہ مل سکے اور پنجاب کی طرف سے ڈیڑھ صدی کے بعد بھی جاری پانی کی چوری اور سینہ زوری کو روکا نہ جا سکے تو پھر وہ نام نہاد خودمختاری کیسی اور کس کام کی؟

سندھ کو وہ قومی خودمختاری چاہیئے، جس میں سندھ کو اختیار حاصل ہو کہ جس میں وہ نہ صرف اپنا پانی کا جائز حصہ لے سکے بلکہ ڈیڑھ صدی سے جاری اس بہیمانہ استحصال، چوری اور سینہ زوری کو بھی روک سکے۔

ثقافتی خودمختاری:

قوموں کی قومی تعمیر و ترقی محض سیاسی اور معاشی ذرائع سے نہیں بلکہ ترقی پسند ثقافتی قوت اور ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ پاکستان میں جس طرح سیاسی اور معاشی معاملات پر پنجاب

---

[11] جامی چانڈیو: "تبدیلیءَ جا محرڪ ۽ سنڌ جو آئيندو"، ترتیب: منیر چانڈیو، سینٹر فار پیس اینڈ سول سوسائٹی حیدرآباد، 2007ء، ص: 107-109

کے حکمران طبقات کی اجارہ داری رہی ہے، اسی طرح پاکستان میں ثقافتی تسلط اردو زبان اور اس کے نام نہاد قومی کلچر کا رہا ہے۔ پاکستان کا کوئی ایک قومی کلچر نہ ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ گذشتہ سات دھائیوں سے جس کلچر کو پاکستانی کلچر کہا جاتا ہے، وہ ملک کی ایک ثقافتی اقلیت کا ہندوستانی کلچر ہے، جس کا اس کا ملک کی کسی بھی تاریخی قوم کے کلچر سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ لیکن چونکہ یہ سندھ میں رہنے والی اردو بولنے والی آبادی کا کلچر بھی ہے، اس لیے ہم اس کو پاکستان کی مختلف ثقافتوں کی دھنک کا ایک رنگ کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کو قومی کلچر کا درجہ ہر گز نہیں مل سکتا۔ پاکستان ایک کثیر قومی، لسانی، نسلی اور ثقافتی ملک ہے، جہاں تاریخی قوموں کی اپنی اپنی پہچان، وطنی حیثیت، زبان، ثقافت، ادب، شاعری کی مختلف و منفرد روایات رہی ہیں۔ پاکستان کے قیام سے لیکر آج تک ملک کی تمام قوموں پر اردو بولنے والی آبادی کی زبان اور ہندوستانی کلچر کو پاکستانی کلچر اور ثقافتی وحدت کی علامت کے طور پر اُبھارنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس ثقافتی تسلط اور جبر نے ملک میں سیاست، معیشت اور ریاست کے دیگر شعباجات کی طرح ثقافت جیسی لطیف چیز کو بھی بیحد متضاد اور متنازعہ بنادیا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک کی بنیادوں میں بھی ایک سبب یہ پنہاں تھا کہ بنگال جیسی ثقافتی حوالے سے امیر اور تاریخی قوم کو اردو کی ثقافتی اجارہ داری کسی بھی صورت میں قبول نہ تھی۔ بنگال کے علاوہ سندھیوں نے بھی ون یونٹ کے دؤر سے لیکر آج تک اس ثقافتی جبر کی مسلسل مزاحمت کی ہے، جو کہ آج تک جاری ہے، لیکن ریاست اور اس پر قابض حکمران طبقات آدھا ملک کھونے کے باوجود تاریخ کے معروضی حقائق سے کوئی سبق حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پاکستان میں صوبائی خودمختاری صرف اسی صورت میں صحیح معنوں میں صوبوں کی خودمختاری کہلائے گی جب قوموں کی تاریخی زبانوں اور ثقافتوں کو قومی درجہ دیا جائیگا اور ان کو آئینی تحفظ بھی فراہم کیا جائیگا۔ جب تک صوبے اپنی قومی، ثقافتی، لسانی اور تعلیمی پالیسیاں بنانے میں خودمختار اور آزاد نہ ہونگے تب تک فقط دکھاوے کی خاطر نام نہاد صوبائی خودمختاری ملک کی مظلوم قوموں کے ساتھ ایک اور بڑے سنگین مذاق کے علاوہ اور کسی بھی حیثیت کی حامل نہیں ہو سکتی۔

پاکستان کی ریاست اس لحاظ سے ایک بدقسمت ریاست ہے، جس نے اپنی اصل خوبصورتی اور قوت یعنی ثقافتی تنوع اور لسانی تکثیریت سے انکار کیا، جس کو ہم مختلف زبانوں، قوموں، نسلوں، ثقافتوں اور مذاہب کی دھنک بھی کہہ سکتے ہیں۔ پاکستان کی کثیر قومی، کثیر ثقافتی اور کثیر لسانی حیثیت اصل میں اس کی ایک قوت تھی، جس کو ریاست کے خود فریب اور بدنیت انکار کی وجہ سے ایک کمزوری اور لامتناہی تضاد میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ دنیا جہان میں عوام کے ہمہ گیر تنوع اور تکثیریت کو ایک سماجی قوت، خوشبختی کی علامت اور اجتماعی خوبصورتی سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن پاکستان نے اپنی اس قوت کو ایک بدترین تضاد اور کمزوی میں تبدیل کر دیا۔

پاکستان کے وفاق، قومی/ صوبائی خود مختاری اور قومی سوال کے اس بحث میں نقطہ ءِ نظر کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جب تک پاکستان کے بنیادی ڈھانچے، طاقت کے توازن اور مفادات میں تبدیلی لاکر، صوبوں میں بسنے والی تاریخی قوموں کو محض صوبائی نہیں بلکہ قومی خود مختاری دیکر اور ملک کی خالق قوموں کے درمیاں، ایک نئے سماجی معاہدے کی بنیاد پر ایک ایسے حقیقی جمہوری وفاق کی بنیاد نہیں رکھی جاتی، جس کی بنیاد 1940ء کی قرارداد پر ہو، تب تک باقی تمام صوبائی خود مختاری کے حوالے سے دکھاوے کی خود فریب کوششیں ملک کے پیچیدہ ریاستی بحران کو مزید سنگین تو کر سکتی ہیں، لیکن اس کا کوئی انصاف پر مبنی پائدار جمہوری حل نہیں نکال سکتیں۔

جمہوری وفاقیت کے بحران کے نتائج:

آج پاکستان میں جو بھی ہمہ گیر ریاستی بحران نظر آتا ہے، اُس کی ایک بنیادی وجہ ملک میں جمہوری وفاقیت کی اصل روح اور نظام سے انحرافی ہے۔ آج پاکستان کو دنیا جہان میں ایک ناکام ریاست اس لئے بھی کہا جاتا ہے، پاکستان میں جمہوری روایات اس لئے بھی کمزور ہیں اور ملک میں تضادات اس لئے بھی سنگین خطرات کی شکل اختیار کر چکے ہیں، کیونکہ ملک کی ریاستی باگ ڈور ایک مخصوص مفاد پرست گروہ کے ہاتھ میں مقید ہے۔ اختیارات کی مرکزیت کا محور عوام یا اس ملک کی اقوام اور اُن کی نمائندہ منتخب اسمبلیاں اور پارلیامینٹ

نہیں بلکہ ایک مخصوص جمہوریت دشمن مفاد پرست گروہ ہے۔ اگر پاکستان میں ریاست اور وفاق کی بنیاد عالمی طور پر تسلیم شدہ جمہوری اور وفاقی اُصولوں اور 1940ء کی قرارداد کی روح کے مطابق رکھی جاتی اور شروع سے جمہوری وفاقیت کی جڑیں مضبوط کی جاتیں، اختیارات کی عدم مرکزیت کو فروغ دیا جاتا، فیصلہ سازی جمہوری طریقے سے اور ملک کی تمام اقوام کے عوام کی یقینی اور برابری کی شرکت سے کی جاتی، پاکستان کو ایک کثیر قومی، کثیر لسانی، کثیر ثقافتی اور کثیر مذہبی ریاست تسلیم کیا جاتا تو شاید پاکستان کے مجموعی حالات اتنے پیچیدہ، بحرانی اور سنگین نہ ہوتے، جتنے کہ آج ہیں۔

آج کے پاکستان کی ریاستی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی صورتحال دیکھ کر ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر پاکستان اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے اور اپنی کمزوریوں کو حقیقی مثبت قوت میں تبدیل کر سکتا ہے تو ہمیں پاکستان کی اساس یعنی 1940ء کی قرارداد کی روح سے رجوع کرنا پڑے گا اور مندرجہ ذیل مطالبات کو تسلیم کر کے ایک سیکیولر، جمہوری، فلاحی اور قوموں کی برابری اور آزادی پر استوار جمہوری وفاق کی بنیاد رکھنا ہو گی۔

مظلوم قوموں اور عوام کے قومی جمہوری مطالبات:

- اگرچہ 1940ء کی قرارداد کی روح پر مبنی وفاقِ پاکستان تو معرضِ وجود میں نہیں آ سکا لیکن 1971ء میں مشرقی بنگال کی علیحدگی کے بعد موجودہ پاکستان اپنا بہت کچھ گنوا چکا ہے۔ 1971ء کے بعد کا پاکستان عملی طور پر وہ پاکستان ہے، جس کا تصور علامہ اقبال نے 1930ء میں الہ آباد میں پیش کیا تھا اور جس کو اُس وقت مسلمان اکثریتی علاقوں کی طرف سے بھی رد کیا گیا تھا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان میں وفاق اور اکائیوں/ قوموں کے درمیاں ایک نیا سماجی معاہدہ تشکیل دیا جائے، جس کی بنیاد 1940ء کی قرارداد اور جمہوری وفاق کے جدید عالمی اُصولوں اور تقاضاؤں پر رکھی جائے۔
- پاکستان کا غیر سیکیولر نام تبدیل کر کے اس کا نام "عوامی جمہوریہ پاکستان" رکھا جائے۔

- 1973ء کا دستور قوموں کے وجود سے انکار، غیر سیکیولر مزاج، مسلسل غیر جمہوری مداخلت اور اور مرکزیت پسندی کی وجہ سے اپنی اہمیت وافادیت مکمل طور پر کھو چکا ہے، اس لئے موجودہ دستور ملک میں موجود سنگین آئینی، سیاسی اور معاشی بحرانات کو حل کرنے کا اہل نہیں رہا، اس لئے 1973ء کے دستور میں سے تمام غیر جمہوری، غیر قانونی اور غیر سیکولر ترامیم ختم کرکے، اس کو صرف ایک عبوری دستور کی حیثیت دے کر ایک نئی دستور ساز اسمبلی کے ذریعے نیا دستور بنایا جائے۔ یہ نیا دستور پاکستان کے چاروں صوبوں اور اس میں بسنے والی تاریخی قوموں اور عوام کے درمیاں ایک نئے "سماجی معاہدے" کا کام دے سکتا ہے، جس میں قوموں کی تاریخی حیثیت اور انکے تاریخی سیاسی، معاشی، ثقافتی اور باقی قومی حقوق کو مکمل طور پر تسلیم کیا جائے۔
- صوبوں میں وزرائے اعلیٰ کی جگہ دنیا کی مختلف وفاقی ریاستوں کی طرح خود مختار وزرائے اعظم کے عہدے رکھے جائیں، کیونکہ خود برِصغیر میں برطانوی دوَر میں بھی صوبوں میں وزرائے اعلیٰ نہیں بلکہ وزرائے اعظم کے منصب ہوتے تھے۔
- وفاقی پرچم کے علاوہ ہر صوبے کو اپنا الگ جھنڈا رکھنے کا آئینی اختیار دیا جائے، جیسا کہ امریکا اور جرمنی کی طرح دنیا کی بیشتر وفاقی جمہوری مملکتوں میں یہ ایک مروج روایت ہے۔
- عبوری دستور میں سے وفاقی فہرست کو مزید کم کرکے، وفاق کو صرف چار بنیادی شعبے یعنی خارجہ پالیسی، دفاع، کرنسی، بین الصوبائی مواصلات اور بین الاقوامی امور دیئے جائیں۔
- امریکا، کنیڈا، جرمنی، آسٹریلیا اور دیگر بہت سے وفاقی ملکوں کی طرح ایک آئینی کورٹ (Constitutional Court) قائم کی جائے، جس کے ذمے دستور کے تحفظ کے ساتھ ساتھ بین الصوبائی اور بین الحکومتی تنازعات کو حل کرنے اور آئینی وحدتوں یعنی صوبوں کے درمیان باہمی جمہوری رشتوں، اختیارات یا وسائل کی تقسیم کو توازن میں رکھنا بھی شامل ہو۔

- صوبوں میں بسنے والی تاریخی قوموں کی دائمی اکثریتی حیثیت کو تسلیم کر کے ان کا اپنے تاریخی وطنوں پر مستقل حقِ حاکمیت تسلیم کیا جائے اور اس کے مستقل تحفظ کے لئے ان کو آئینی ضمانت دی جائے۔
- صوبے محض انتظامی یونٹ نہیں بلکہ مقامی قوموں کے تاریخی وطن ہیں۔اس لئے ریاست کو کوئی بھی اخلاقی اور آئینی اختیار نہیں ہے کہ وہ دھرتی کے اصل مالکوں کی مرضی اور ان کے تاریخی حقوق کے خلاف صوبوں کی جاگرافیائی حدود کو تبدیل کرے یا ملک میں مزید صوبوں کی بات کرے۔ یہ بات سرائیکی صوبے پر اس لیے بھی لاگو نہیں کہ سرائیکی تاریخی طور پر ایک الگ قومیت ہیں اور تاریخی طور پر وہ پنجاب کا حصہ نہیں رہے۔ رنجیت سنگھ نے 19ویں صدی کے آغاز میں سرائیکی وسیب کے خود مختار علاقوں پر قبضہ کر کے ان کو پنجاب میں ضم کر دیا تھا۔اس لیے سرائیکی صوبہ کے جائز سوال کو سندھ کے لیے ایک بلیک میلنگ کے کارڈ کے طور پر استعمال نہ کیا جائے۔
- سندھ میں غیر قانونی طور پر رہنے والے 50 لاکھ غیر ملکیوں کو واپس اپنے اپنے ملک بھیجنے کا بندوبست کیا جائے اور جب تک وہ واپس ہو سکیں، تب تک تمام غیر ملکیوں کی مکمل رجسٹریشن کی جائے اور ان کو کوئی سیاسی و آئینی حق نہ دیا جائے۔البتہ ان کے انسانی حقوق کا تحفظ ہر قیمت پر ضروری ہے۔
- پاکستان کے وفاقی ادارے کسی بھی طرح وفاقی ادارے کہلانے کے حقدار نہیں ہیں، کیونکہ ان پر پنجاب اور حکمران طبقے کے مخصوص گروہوں کی اجارہ داری رہی ہے۔اس لئے تمام وفاقی اداروں اور بیوروکریسی میں چاروں صوبوں اور اس میں بسنے والی تاریخی قوموں کے عوام کو میرٹ کی بنیاد پر برابر نمائندگی دی جائے۔
- عوامی معاملات یا سیاست میں فوج کا کوئی بھی کردار نہیں ہونا چاہیئے۔پاکستان کی فوج کو حقیقی معنوں میں وفاقی فوج بنانے کیلئے تمام صوبوں اور اس میں بسنے والی تاریخی مقامی قوموں کو برابر نمائندگی دی جائے۔

- پاکستان کی دفاعی بجیٹ نہ تو شفاف طریقے سے طے ہوتی ہے اور نہ خرچ۔ اس لئے لازمی طور پر یہ بجیٹ پارلیامینٹ کے دونوں ایوانوں میں بحث کے لئے پیش ہونی چاہیئے اور پارلیامینٹ کے ساتھ چاروں صوبائی اسمبلیوں کی مشترکہ منظوری کے بعد ہی دفاعی بجیٹ کو پاس کیا جائے۔
- پاکستان میں حقیقی جمہوری وفاق کبھی بھی نہیں رہا بلکہ خصوصاً مشرقی بنگال کی علیحدگی کے بعد پاکستانی وفاق سخت عدم توازن کا شکار رہا ہے۔ ایک بالادست صوبے کو پارلیامینٹ میں باقی تینوں صوبوں پر عددی اور سیاسی برتری حاصل ہے اور وہ صوبہ ایسی اکثریت کی بنا پر تمام ریاستی معاملات میں اپنی اجارہ داری اور مرضی کا مالک ہے۔ اختیارات کی ایسی مرکزیت پاکستان میں صوبائی اور قومی تنازعات کی اصل بنیاد ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ تمام صوبوں کو سینٹ میں یکساں نمائندگی دی جائے اور ان کی برابر حیثیت کو قبول کیا جائے لیکن اس کے لئے لازم ہے کہ ہر صوبے سے سینٹ کی نمائندگی کے لئے کم سے کم 2/3 اکثریت صوبی کے مقامی اور اصل باشندوں سے ہو۔
- صوبوں کی نمائندہ سینٹ کو یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ بجیٹ، دفاعی اخراجات اور مانیٹری بلوں کو پاس یا رد کر سکے۔ ساتھ میں دوسرے ممالک کے ساتھ ہونے والے معاشی اور سفارتی معاہدوں کی چھان بین اور حتمی منظوری بھی سینٹ سے ہونی چاہیئے۔
- وفاقی سطح پر ہونے والی تمام تقرریوں کی حتمی توسیع سینٹ سے ہونی چاہیئے، جس میں سپریم کورٹ کے جج صاحبان، چیف الیکشن کمشنر، فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے ممبران، سفیر، خود مختار اداروں اور کارپوریشنس کے سربراہ، صوبوں کے گورنر اور مسلح افواج کے سربراہ آجاتے ہیں۔
- سندھ میں ون یونٹ کے دوٗر سے آرمی اور وفاقی بیوروکریسی کو سندھ میں دی گئی تمام زمین ان سے واپس لیکر بے زمین مقامی کسانوں کو دی جائے۔
- پانی کا تنازعہ ملک میں اہم تنازعہ کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ سندھ دریائے سندھ کے نچلے آخری چھیڑے پر واقع ہے۔ اس لئے اس پر پانی کے حوالے سے سب سے پہلا اور بنیادی

حق بھی سندھ کا ہے۔ پاکستان کے دستور یا عالمی قوانین کے مطابق آخر والوں کا دریا پر اولین اور آخری حق تسلیم کیا گیا ہے۔ سندھ کو دریائے سندھ پر مزید کوئی بیراج، ڈیم یا کینال وغیرہ منظور نہیں ہے، اور آخر میں آنے والے فریق کی حیثیت میں یہ سندھ کا بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ آئینی اور تاریخی حق ہے اور دریائے سندھ پر سندھ سے اوپر مزید کوئی بھی ڈیم، کینال یا بیراج تعمیر نہیں کیا جائے۔ پرویز مشرف کی طرف سے بدنیتی سے تیار کیا ہوا واپڈا کا نام نہاد Vision 2025 دریائے سندھ کا قاتل منصوبہ ہمیشہ کے لئے ختم کیا جائے۔

- تمام صوبوں میں پانی کی انصاف پر مبنی تقسیم کو 1945ء کے سندھ طاس معاہدے کے تحت عمل میں لایا جائے۔
- قدرتی اور مالیاتی وسائل کے تمام اختیارات عملی اور مکمل طور پر صوبوں کے حوالے کیئے جائیں اور جہاں سے بھی تیل، گیس، کوئلہ یا دوسرے معدنیات ملیں، اس کی صرف 25 فیصد رائلٹی وفاق، 25 فیصد متعلقہ ضلع اور 50 فیصد اس صوبے کو دی جائے، جو اس صوبے کے دیگر پسماندہ اور غریب علاقوں پر خرچ کیا جائے۔
- پاکستان کی پانچ قومیتوں کی زبانوں پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور سرائیکی زبانوں کو قومی اور دیگر تمام زبانوں کو وفاقی زبانوں کا درجہ دیا جائے۔ اردو اور انگریزی کا درجہ وفاقی سطح پر رابطے اور دفتری زبانوں کا ہو۔
- ملک میں عدم مرکزیت کے لیے ایک حقیقی معنوں میں خود مختار مکانی حکومتوں کا میونسپل اور میٹروپولیٹن نظام وضع کیا جائے، اور تمام وفاقی جمہوری ممالک کی طرح ان حکومتوں کو متعلقہ صوبوں کے ماتحت کیا جائے۔
- پاکستان کی خارجہ پالیسی میں صوبوں اور سینٹ کے کردار کو آئینی ضمانت دی جائے۔
- کنفیڈرل جمہوریہ کانگو اور دیگر وفاقی ممالک کی طرح صوبوں اور ان میں بسنے والی تاریخی قوموں کو وفاقِ پاکستان سے مطمئن نہ ہونے کی صورت میں وفاق سے علیحدگی کا رضاکارانہ جمہوری حق (Right of self determination) دیا جائے۔

Bibliography:

Books

1. Adeney, Katharine. *Federalism and Ethnic Conflict Regulation in India and Pakistan.* New York: Palgrave MacMillan, 2007.
2. Ali, Mehrunnisa. *Politics of Federalism in Pakistan.* Karachi: Royal Book Company, 1996.
3. Amoretti, Ugo and Nancy Bermeo, eds. *Federalism and Territorial Cleavages*. Baltimore: Johns Hopkins, 2004.
4. Aziz, K.K. *The Making of Pakistan: A Study in Nationalism.* Lahore: Sand-E-Meel, 2005.
5. Cheema, Pervaiz Iqbal and Rashid Ahmad Khan, eds. *Problems of Federalism in Pakistan*. Islamabad: Islamabad Policy Research Institute, 2006.
6. Cohen, Stephen Philip. *The Idea of Pakistan*. Washington D.C.: Brookings, 2004.
7. Joyo, Mohammed Ibrahim. *Save Sindh, Save the Continent*. Hyderabad: Sindh Democratic Party, 2000.
8. Kazimi, M.R. *Pakistan Studies.* Karachi: Oxford, 2007.
9. Khan, Hamid. *Constitutional and Political History of Pakistan.* Karachi: Oxford, 2005.
10. Nazir, Muntzra. *Federalism in Pakistan: Early Years.* Lahore: Pakistan Study Centre, 2008.
11. Palijo, Rasul Bux. *Sindh-Punjab Water Dispute 1859-2003.* Hyderabad: Center for Peace and Human Development, 2003.
12. Syed, G.M. *The Case of Sindh – G.M. Syed's Deposition in Court (Part 1)*. Karachi: Naeen Sindh Academy. http://www.sindhudesh.com/gmsyed/case/saeen-book1.htm
13. Talbot, Ian. *Pakistan: A Modern History*. London: Hurst, 2005.
14. Waseem, Mohammad. *Politics and the State in Pakistan*. Islamabad: National Institute of Historical and Cultural Research, 2007.
15. Ziring, Lawrence. *Pakistan in the Twentieth History: A Political History*. Karachi: Oxford, 2007.

16. Joyo, Mohammed Ibrahim. "*Sindh Muhnje Khawabn Jee.*" . Center for Peace & Civil Society, Hyderabad, 2008.
17. Chandio, Jami, "*Dynamics of Change & Future of Sindh*", Center for Peace & Civil Society Hyderabad, 2007.
18. Chandio, Jami, "*Crisis of Federalism and Prospects for Provincial Autonomy in Pakistan*", 2009.

Articles

1. Adeney, Katharine. "Constitutional Centring: Nation Formation and Consociational Federalism in India and Pakistan." *Commonwealth and Comparative Politics* 40, no. 3 (2002): 8-33.
2. Ahmad, Eqbal. "Meanings in the Disaster" *Dawn.* April 17, 1994.
3. Ahmed, Feroz. "Ethnicity, Class and State in Pakistan." *Economic and Political Weekly*, 31, no. 47 (1996): 3050-3053.
4. Ahmed, Dr. Gulfaraz. "Fiscal Federalism: Resource Sharing Issues." Pakistan Institute of Development Economics, February 21, 2007.
5. Ahmed, Iftikhar, Usman Mustafa and Mahmood Khalid. "National Finance Commission Awards in Pakistan: A Historical Perspective." PIDE Working Papers 2007:33, Pakistan Institute of Development Economics, Islamabad, 2007.
6. Cohen, Stephen Philip. "The Nation and the State of Pakistan" The Washington Quarterly 25, no. 3 (2002): 109–122.
7. Haqqani, Husain. "The Role of Islam in Pakistan's Future." The Washington Quarterly 28, no. 1 (2004): 85–96.
8. Hippler, Jochen. "Problems of Democracy and Nation-Building in Pakistan." Nation-Building in Pakistan. http://www.jochen-hippler.de/neu-aufsaetze/Nation-Building-Pakistan.htm
9. Kennedy, Charles H. "Policies of Ethnic Preference in Pakistan." *Asian Survey* 24, No. 6 (Jun., 1984): 688-703.

10. Khan, Adeel. "Pakistan's Sindhi Ethnic Nationalism: Migration, Marginalization, and the Threat of "Indianization" *Asian Survey* 42, No. 2 (2002): 213-229.
11. Kundi, Dr. Mansoor Akbar. "Federalism/Demarcation of Roles for Units in Pakistan." (Unpublished article)
12. Memon, Dr. Aman. "Provincial Autonomy in Historical Perspective: Case Study of Sindh." (Unpublished Article)
13. Memon, Rafique-ul-Rehman. "Fiscal Decentralization and Inter-Governmental Transfer Systems: Issue of NFC in Pakistan." (Unpublished Working Paper)
14. Memon, Naseer. "Oil & Gas Resources and Rights of Provinces." (The Sindh Case- 2014)
15. Naseer, Sajjad. "Federalism and Constitutional Development in Pakistan" Paper presented at an international seminar on "Constitutionalism and Diversity in Nepal" organized by Centre for Nepal and Asian Studies, Kathmandu, Nepal, August 22-24, 2007.
16. Nazir, Muntzra. "The Problems and Issues of Federalism in Pakistan." *Journal of Pakistan Vision*. 9, no. 1, (2007): 109-128.
17. Rahman, Tariq. "Language, Politics and Power in Pakistan: The Case of Sindh and Sindhi" *Ethnic Studies Report*. 17, no. 1 (1999): 21-34.
18. Rizvi, Hasan-Askari. "Democracy in Pakistan." Paper prepared for the Project on State of Democracy in South Asia as part of the Qualitative Assessment of Democracy, Lokniti (Programme of Comparative Democracy), Centre for the Study of Developing Societies, Delhi.
19. Stepan, Alfred. "Federalism and Democracy: Beyond the U.S. Model" *Journal of Democracy* 10, no. 4 (1999): 19-34.
20. Tellis, Ashley J. "U.S. Strategy: Assisting Pakistan's Transformation" *The Washington Quarterly* 28, no. 1. (2004): 97–116.
21. Waseem, Mohammad. "Affirmative Action Policies in Pakistan." *Ethnic Studies Report*, 15, no. 2 (1997): 223-245.

22. Waseem, Mohammad. "Pluralism and Democracy in Pakistan." *International Journal on Multicultural Societies (IJMS)* 5, no. 2 (2003): 172-176.
23. Wilkinson, Steven. "Democratic Consolidation and Failure: Lessons from Bangladesh and Pakistan." Democratization 7, no. 3 (2000): 203-226.

Reports

1. Davis, Ralph K. Report for 2003AR57B: Analysis of Water Conflicts in Pakistan and the Middle East - A Comparative Study. U.S. Geological Survey. 2003.
2. Harrison, Selig S. "Pakistan: The State of the Union." Special Report. Center for International Policy. April 2009.
3. International Crisis Group. "Pakistan's Tribal Areas: Appeasing The Militants." Asia Report No125. December 11, 2006.
4. International Crisis Group. "Pakistan: The Forgotten Conflict in Balochistan." Update Briefing. Asia Briefing No69. October 22, 2007.
5. International Crisis Group. "Pakistan: The Worsening Conflict in Balochistan" Asia Report No119. September 14, 2006.
6. Laghari, Munawar. "Sindh Monitor: Plight of Sindhis in Pakistan." United Nations. Council on Human Rights, 10th Session, Geneva, March 2-27, 2009.
7. Markey, Daniel. "Securing Pakistan's Tribal Belt." Council on Foreign Relations – Center for Preventive Action. CSR No. 36, August 2008.
8. Mezzera, Marco and Safiya Aftab. "Pakistan State-Society Analysis." Report from the Democratisation and Transitional Justice Cluster. Initiative for Peacebuilding. January 2009.
9. Nawaz, Shuja. "FATA: A Most Dangerous Place" Center for Strategic and International Studies Report. January 2009.
10. Proceedings from Workshop for NWFP MPAs on Federal, Provincial and Local Governments: Demarcation of Roles, Issues and Possible Solutions.

PILDAT Legislative Capability Building Programme. Hotel Pearl Continental, Peshawar, August 27-28, 2003.
11. Schaffer, Teresa. "Pakistan's Future and U.S. Policy Options." A Report of the CSIS South Asia Program. Center for Strategic and International Studies. March 2004.
12. "The Next Chapter: The United States and Pakistan" A Report of the Pakistan Policy Working Group. September 2008.
13. Ul Haq, Dr. Noor (ed.). "The Indus Waters Treaty (Abridged) September 19, 1960." In *Water Issue in Perspective*. Islamabad Policy Research Institute. http://ipripak.org/factfiles/ff45.shtml
14. Wadhams, Caroline, Brian Katulis, Lawrence Korb, and Colin Cookman. "Partnership for Progress: Advancing a New Strategy for Prosperity and Stability in Pakistan and the Region" Center for America Progress Report. November 2008.

جامی چانڈیو کی شایع شدہ کتابیں

1 تنهن پاڻيءَ پُنا ڏينهڙا (پاڪستان ۾ رياستي بحران ۽ قومي سوال) 2006ع

2 تبديليءَ جا محرڪ ۽ سنڌ جو آئيندو (2007ع)

3 جمهوريت، صحافتي اخلاقيات ۽ ميڊيا (2007ع)

4 ايم ڪيو ايم جي سياست ۽ سنڌ (چاپو ٽيون) 2007ع

5 ڪي ماڻهو تاريخ ٿين ٿا (2007ع)

6 ادب، سياست ۽ سنڌي سماج (چونڊ فڪري ليڪچر)

7 پاڪستان ۾ جمهوري وفاقيت جو بحران ۽ قومي خود مختياري (2012ع)

8 پاکستان میں جمہوری وفاقیت کا بحران اور قومی خود مختیاری (اپریل 2011ع)

9 سنڌ ۾ قبيلائي ۽ شهري دهشتگرديءَ کي ڪيئن منهن ڏجي؟ (آڪٽوبر 2010ع)

11 ڦِريا پَسي ڦيڻَا! (2016ع)

(پاڪستان پيپلز پارٽيءَ جي سياست جو تاريخي ۽ تنقيدي جائزو)

12 سَنڌي جوڳيان ذاتِ (ڊسمبر 2016ع) فڪري، ادبي ۽ علمي پرک

13 سنڌي سماج (تاريخي ۽ تنقيدي اڀياس) 2018ع

14 وفاقیت ایک تعارف جارج اینڈرسن / ترجمہ: جامی چانڈیو

15 رسول بخش پليجي جون مڪمل تحريرون (2005ع

سياسي ادب (پاڱو پهريون جلد 1)، مرتب: جامي چانڊيو

رسول بخش پليجي جون مڪمل تحريرون (2006ع)

سياسي ادب (پاڱو پهريون جلد 2)، مرتب: جامي چانڊيو

16 رسول بخش پليجي جون مڪمل تحريرون (2007ع)

سياسي ادب (پاڱو پهريون جلد 3)، مرتب: جامي چانڊيو

17 رسول بخش پليجي جون مڪمل تحريرون (2012ع)

تنقيدي ۽ تخليقي ادب (پاڱو پهريون جلد 4) مرتب: جامي چانڊيو

18 سنڌ ڪيس (نومبر 2009ع) سهيڙيندڙ: جامي چانڊيو

19 پاکستان میں قومی تضاد اور سندھ کا مقدمہ (دسمبر 2010ء)

-مرتب: جامی چانڈیو

20 شيخ اياز (فيبروري 1998ع)
سنڌي ادب ۾ تنقيد، (اينٽالاجي) حصو پهريون
(مرتب: جامي چانڊيو)

21 ڪلاسيڪي ۽ جديد سنڌي شاعري 2007ع
سنڌي ادب ۾ تنقيد (اينٽالاجي) حصو ٻيو
(مرتب: جامي چانڊيو)

22 افسانوي ۽ فڪري ادب 2007ع
سنڌي ادب ۾ تنقيد (اينٽالاجي) حصو ٽيون
(مرتب: جامي چانڊيو)

23 لبرل ازم: هڪ اپياس سنڌيڪار: جامي چانڊيو

جامی چانڈیو کی زیرِ اشاعت کتابیں

1 نئين سنڌ لاءِ تدبيرون ۽ حڪمت عملي
2 پاڪستان جي رياست ۽ سياست جا تضاد
3 ننڍي ڪنڊ ۾ وفاقيت ۽ پاڪستان جو رياستي بحران
4 منهنجا پرڏيهي سفر (28 ملڪن جا سفري احوال)
5 روشن خيالي، ادب اور سماج (اردو)
6 سنڌي ادب جو تنقيدي اپياس